تقطیع بڑی، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی، قیمت سے ۔ پتہ: ادارۂ ادبیات اردو، خیرت آباد حیدرآباد دکن،

اردو زبان کے متعلق ادارۂ ادبیات اردو کی خدمات محتاج تعارف نہیں، اس کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے ایک قلیل مدت میں ایک وسیع کتب خانہ فراہم کرلیا ہے جس میں عربی، فارسی اور خاص طور سے اردو کی بارہ ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں، ان مطبوعات کے علاوہ اردو کے بہت سے نادر مخطوطات ہیں، مطبوعہ کتابوں میں بھی بہت سی اتنی قدیم ہیں کہ اب نادر ونایاب کی حیثیت رکھتی ہیں، اردو کے نادر مخطوطات کی فہرست کئی سال ہوئے شائع ہو چکی ہے، اب مطبوعہ کتابوں کی فہرست کی پہلی جلد مرتب کرکے شائع کی ہے، اس میں چار ہزار کتابوں اور ایک ہزار اخبارات ورسائل کی فہرست ہے، ان میں سے بہت سے اب نادر ونایاب ہیں، اردو پر کام کرنے والوں کے لیے یہ فہرست بڑی مفید اور کار آمد ہے،

وجدان حافظ۔ مترجمہ جناب منور لکھنوی، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۰۶ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عمہ، پتہ: کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، دہلی،

شیام چرن داس صاحب سر یواستو دہلی کی پرانی یادگاروں میں ہیں، انکو تصوف اور الٰہیات سے خاص ذوق ہے اور عملاً بھی انکی زندگی صوفیانہ اور درویشانہ ہے، اسلیے انکو خواجہ حافظ کے کلام سے بھی خاص دلچسپی ہے، چنانچہ انھوں نے اسکا ایک انتخاب عرفانِ حافظ کے نام سے مرتب کیا تھا، وجدانِ حافظ اسی کا منظوم ترجمہ ہے، کسی زبان کی نظم کا دوسری زبان کی نظم میں ترجمہ کرنا یوں بھی مشکل کام ہے، خصوصاً حافظ کے جیسے سراپا فصاحت و لطافت کلام کا ترجمہ تو بھی دشوار ہے، لیکن لائق مترجم کی مہارت معروف ومسلّم ہے، اسلیے انھوں نے ترجمہ میں ممکن حد تک اصل کی خوبی ولطافت کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کی ہے، اور بعض اشعار کے ترجمے تو ایسے برجستہ ہیں کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتے، کتاب کے ایک صفحہ میں اصل فارسی کا شعر ہے اور اسکے بالمقابل دوسرے صفحہ میں اسکا منظوم ترجمہ ہے، جن لوگوں کو حافظ کے کلام کا ذوق ہے ان کو اس شراب دو آتشہ سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ "م"

جلد ۷۹ ماہ شعبان المعظم ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۵۷ء نمبر ۳

فہرست مضامین

شذرات

افسوس ہے کہ اعظم گڈھ کی ممتاز و مقبول شخصیت مرزا سلطان احمد صاحب ریٹائرڈ ممبر بورڈ آف ریونیو نے طویل علالت کے بعد گذشتہ ۱۰ فروری کو انتقال کیا، وہ پرانے علیگ اور اپنے زمانہ کے لایق ترین عہدہ داروں میں تھے، اپنی قابلیت سے ڈپٹی کلکٹری سے کلکٹری اور بورڈ کی ممبری تک ترقی کی اور جہاں رہے اپنی دیانتداری اور شرافت سے مقبول و نیکنام رہے، بڑے عہدہ داروں میں ایسے شریف اور خلیق انسان کم دیکھنے میں آئے ہیں، ان کا خمیر ہی اخلاق و شرافت سے گوندھا گیا تھا، ادنیٰ و اعلیٰ ہر شخص کے ساتھ ان کا اخلاق یکساں تھا، ہر ملنے والے کے ساتھ کوئی نہ کوئی ایسی خصوصیت ضرور برتتے تھے جس سے اس کو یہ محسوس ہوتا کہ وہ اس کے ساتھ خاص تعلق رکھتے ہیں،

بڑے وضعدار، فیاض اور مہمان نواز تھے، جس سے جس قسم کے تعلقات تھے، اس کو عمر بھر نباہا، ملازمت کے زمانہ میں ان کا دسترخوان بڑا وسیع اور گھر مستقل مہمان خانہ تھا، ان کے اعزہ و احباب میں سے کوئی نہ کوئی ان کے یہاں مستقل مقیم رہتا تھا، اور جس کو ضرورت ہوتی اسکی نقدی سے بھی مدد کرتے تھے، ہر حاجت مند کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے، اور اس کے لیے ایسے ایسے کام کر گذرتے تھے جس کی ہمت ہر شخص نہیں کر سکتا، وہ بڑے تنخواہ دار تھے، لیکن جو کچھ کمایا سب صرف کر دیا، اعظم گڈھ میں دو ہی ایسے شخص تھے جنھوں نے بہت پیدا کیا، مگر اپنے بعد کچھ نہیں چھوڑا، ایک مرزا صاحب، دوسرے اقبال سہیل مرحوم، ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد حکومت پاکستان نے ان کے سامنے پبلک سروس کمیشن کی ممبری پیش کی، مگر انھوں نے وطن چھوڑنا پسند نہ کیا، اور اعظم گڈھ کی سرزمین ہی میں پیوند خاک ہوئے،

دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے پرانے رکن اور اس کے خاص ہمدردوں میں تھے، اور یہاں کے لوگوں سے ان کے عزیزانہ تعلقات تھے، انکی موت سے اعظم گڈھ کا شریف ترین انسان اٹھ گیا جس کا بدل پیدا ہونا اب مشکل ہے، اللہ تعالیٰ انکی نیکیوں کے طفیل میں انکی مغفرت فرمائے، انتقال کے وقت کل ۶۳ سال کی عمر تھی،

یہ خبر بھی افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ مولانا سید شاہ محمد قمر الدین صاحب پھلواروی امیر شریعت صوبہ بہار نے ۳۱ جنوری کو انتقال فرمایا، مرحوم مولانا سید شاہ بدر الدین صاحب مرحوم امیر شریعت اول کے صاحبزادے اور علم و عمل میں اپنے اسلاف کرام کے خلف الصدق تھے، اپنے بڑے بھائی مولانا سید شاہ محی الدین صاحب مرحوم امیر شریعت ثانی کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے، اور امارت شرعیہ کی روایات اور اس کے مذہبی کاموں کو پوری طرح قائم و برقرار رکھا، ان کی وفات سے خاندان پھلواری کی ایک اہم یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے اور ان کے اخلاف کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔

اس مرتبہ علی گڈھ میں جامعہ اردو کی ترقی کے حالات سنکر بڑی مسرت ہوئی، اس کے لائق اور سراپا عمل رجسٹرار سید ظہیر الدین صاحب علوی لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی کی سعی اور جد و جہد سے جامعہ کے امتحانات کا دائرہ بڑا وسیع ہو گیا ہے، ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس کے سنٹر قائم ہو گئے ہیں، اور اس صوبہ کے تو قریب قریب ہر ضلع میں ہیں، اس سال اس کے امتحانات میں چھ ہزار طلبہ شریک ہوئے، کئی یونیورسٹیوں نے اس کے اسناد کو تسلیم کر لیا ہے، اور اس کے پاس شدہ کو وہی مراعات دیتی ہیں جو السنۂ مشرقیہ کے سرکاری امتحانات کے پاس شدہ کو حاصل ہیں، امید ہے کہ دوسری یونیورسٹیاں بھی اس کو تسلیم کر لیں گی، اس نے اپنے امتحانات کی کتابوں کی طباعت و اشاعت اور فروخت کا بھی انتظام کر دیا ہے، اس کا ایک بڑا دفتر اور وسیع عملہ ہے، اس طرح اب وہ اردو کا ایک بڑا مستحکم ادارہ بن گئی ہے، اور یہ نتیجہ ہے تنہا علوی صاحب کی کوششوں کا، اگر اردو کے کارکنوں

ہیں ایسے چند عملی آدمی بھی پیدا ہو جائیں تو اس کے مستقبل سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں،

ناظرین معارف کو یہ خوشخبری سنکر مسرت ہوگی کہ دار المصنفین کی مالی حالت سے متاثر ہو کر حکومت کشمیر نے اس کو دس ہزار کا گرانقدر عطیہ دیا ہے، یہ عطیہ ایسے وقت میں ملا ہے جب دار المصنفین سخت مالی مشکلات میں مبتلا ہے، اس سے اس کو بڑی مدد مل جائیگی، اس عطیہ کے لیے ہم حکومت کشمیر، اس کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد صاحب اور دار المصنفین کے محترم صدر جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب نائب وزیر خارجہ حکومت ہند کے شکر گذار ہیں جنکی توجہ آڑے وقتوں میں ہمیشہ دار المصنفین کے کام آتی ہے،

ہماری توقع کے مطابق سیرۃ النبی کی طباعت کے معاملہ میں پنجاب کے اخبارات خاص طور سے نوائے وقت اور ہفتہ وار چٹان اور قندیل نے دار المصنفین کے ساتھ عملی ہمدردی کا ثبوت دیا، اور انکے احتجاج اور شیخ حامد محمود صاحب، صدر پاکستان پبلشرز اینڈ بک سیلرز ایسوسی ایشن کی کوشش سے محمد شفیع صاحب مالک مکتبہ مصطفائی نے سیرۃ النبی کی طباعت پر تحریری معذرت نامہ لکھا ہے، اور وعدہ کیا ہے کہ آیندہ سے وہ دار المصنفین کی کوئی کتاب نہ چھاپیں گے، ہم ان تمام اخبارات اور شیخ حامد محمود صاحب کے شکر گذار ہیں جنکی کوشش سے یہ معاملہ طے ہو گیا اور دار المصنفین نقصان سے بچ گیا، مگر ضرورت اسکے مستقل انسداد کی ہے، اگر پنجاب کا پریس اور وہاں کے با اثر اصحاب اسی طرح اپنا فرض انجام دیتے رہیں تو یقین ہے کہ پھر کسی ناشر کو اس قسم کی جرأت نہ ہوگی،

تفسیر ماجدی کے دو حصے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں، اب اسکا تیسرا حصہ شائع ہوا ہے، یہ حصہ سورہ یونس سے لیکر سورہ نحل تک کی تفسیر پر مشتمل ہے، اس تفسیر کی خصوصیات سے اہل علم واقف ہیں، اسلیے کسی تبصرہ و تعارف کی ضرورت نہیں، وہ علم و تحقیق، عقل و نقل، روایت و درایت اور تعبیر و ترجمانی کی صحت ہر لحاظ سے اردو کی تفسیروں میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے، اور اس میں قدیم و جدید دونوں طبقوں کی تشفی کا پورا سامان ہے، ان معنوی محاسن کے ساتھ تاج کمپنی کی طباعت کے ظاہری حسن و نفاست سے بھی آراستہ ہے، قیمت معلوم نہیں، تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی، لاہور اور ڈھاکہ سے ملے گی،

مقالات

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

(نقوش و تاثرات)

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم، اے

مولانا مناظر احسن رحمۃ اللہ علیہ ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں گیلانی کے رہنے والے تھے، یہ گاؤں راقم کے وطن دیسنہ سے دو کوس کے فاصلہ پر ہے، ضلع پٹنہ کی مشرقی سرحد کا آخری گاؤں ہے، اسکے بعد مونگیر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے، اسکا ڈاک خانہ بر بگہہ ہے، جو گیلانی سے ایک میل پر مونگیر میں ہے، اس لیے مولانا مرحوم سے خط و کتابت کرنے والے ان کو ضلع مونگیر کے ضلع کا باشندہ سمجھتے تھے، لیکن وہ در اصل پٹنہ ضلع ہی کے رہنے والے تھے،

یہ سطور لکھتے وقت ۱۹۲۰ء کا زمانہ یاد آرہا ہے، جبکہ راقم کے وطن دیسنہ کی آب و ہوا وبائی امراض کی وجہ سے خراب ہو گئی تھی، اس لیے گھر کے تمام لوگ گیلانی منتقل ہو گئے تھے، جہاں ہمارے بعض خاص اعزہ بھی رہتے تھے، ہم جس عزیز کے گھر میں مقیم تھے، اسی کے سامنے ایک بڑا مکان تھا، جس سے مکینوں کی خوشحالی اور فارغ البالی کا اندازہ ہوتا تھا، راقم اس زمانہ میں سن شعور کو بھی نہ پہنچا تھا، لیکن کانوں میں یہ آواز پڑی کہ یہ مکان مولانا مناظر احسن صاحب کا ہے اور گھر میں ان کے متعلق احترام و عقیدت کی جو باتیں سنیں ان سے یہ اندازہ ہوا کہ کوئی بڑے اچھے

مولانا صاحب ہیں، اور شوق پیدا ہوا کہ کاش ان کو دیکھتا،

غالباً ۱۹۲۱ء کا زمانہ تھا، ترک موالات کی تحریک زوروں پر تھی، اس وقت راقم اس تحریک کی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر تھا، لیکن گھر کے بعض بزرگوں کو مولانا مناظر احسن کی ایک نظم پڑھتے سنا جس کے معنوی تو نہیں لیکن صوتی اثرات دل پر ایسے قائم ہوئے کہ مولانا کی ذات گرامی سے دلچسپی کچھ اور بڑھی، گھر میں ان کا ذکر برابر ہوتا رہتا تھا، وہ اس وقت جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں لکچرار ہو چکے تھے، اور ان کی علمی قابلیت و استعداد کے چرچے سے کان آشنا ہونے لگے تھے، گھر میں اعزہ ان سے زیادہ ان کے دادا، چچا اور والد کے فضائل کا ذکر کرتے جنھیں سنکر دل میں یہ اثر ہوا کہ مولانا ایک بڑے اہل علم خاندان کے فرزند ہیں، ان کے دادا مولانا سید محمد احسن اپنے زمانہ کے جید عالم تھے، یہ معلوم کرکے اور تعجب ہوا کہ انھوں نے شادی اور صاحب اولاد ہونے کے بعد تعلیم شروع کی تھی، اس کا واقعہ یہ ہے کہ جب ان کے پہلی اولاد ہوئی تو کسی نے ان کے ان پڑھ ہونے پر طنز کیا، اس کا ان کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ وہ چپکے سے تعلیم کے لیے گیلانی سے نکل کھڑے ہوئے، اور بنارس، لکھنو اور رام پور میں تعلیم حاصل کرکے چودہ سال کے بعد وطن لوٹے، اور جب ان کے علم کی شہرت پھیلی تو نہ صرف اطراف و جوانب بلکہ مختلف صوبوں سے طلبہ آکر ان سے فیض حاصل کرنے لگے، ان کے شاگردوں میں ملا عبد اللہ ہزارہ صوبہ سرحد کے تھے، وہ مولانا کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ گیلانی ہی میں متوطن ہو گئے، ملا عبد اللہ کے زہد و ورع کے قصے اطراف و جوانب میں اب بھی شوق سے کہے اور سنے جاتے ہیں، مولانا احسن کے شاگردوں میں مولوی محمد رفیع صاحب (شکر انواں ضلع پٹنہ) مولوی عبد الغفور صاحب (کونہ ضلع پٹنہ) اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب (رمضان پور ضلع پٹنہ) بھی تھے، یہ تینوں اپنے اطراف کے بڑے رئیس بھی تھے،

مولانا احسن کے دو صاحبزادے تھے، مولانا حاجی ابو نصر، اور مولانا حافظ ابو الخیر، جو مولانا مناظر احسن کے والد تھے، مولانا ابو نصر اپنے علم و فضل اور شعر و شاعری کے ذوق کی وجہ سے اپنے ہم چشموں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، انھوں نے بھی رام پور اور لکھنو میں تعلیم پائی تھی، مولانا مناظر احسن نے ان ہی سے ابتدائی کتابیں پڑھیں، ان کے والد حافظ ابو الخیر صاحب زیادہ تر زمینداری اور کاشتکاری کے کاموں میں لگے رہے، ان کو آموں کے باغ لگانے کا بڑا شوق تھا، اور ان کے باغ کے آم دور دور تک مشہور تھے، بڑے مخیر اور فیاض تھے، ان کی سخاوت و فیاضی کے واقعات سن کر دل پر یہ اثر تھا کہ مولانا مناظر احسن ایسے گھر کے چشم و چراغ ہیں، جہاں علم و فضل کے علاوہ خوشحالی اور فارغ البالی بھی ہے، اس لیے ان کی زیارت کی خواہش دل میں روز بروز بڑھتی گئی،

دسمبر ۱۹۲۳ء کے آخری ہفتہ میں دیسنہ میں ایک تقریب تھی جس میں شرکت کے لیے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی بھی اعظم گڈھ سے وطن تشریف لائے تھے، ایک رات وہ صاحب تقریب کے گھر میں بیٹھے تھے کہ معلوم ہوا کہ مولانا مناظر احسن گیلانی سے تشریف لائے ہیں اور حضرت سید صاحب سے ملنے کے لیے آرہے ہیں، دل میں ان کی زیارت کا اشتیاق عرصہ سے تھا، اس لیے اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی، اور تھوڑی دیر میں میانہ قد، گندمی رنگ کا ایک خوش وضع اور دلکش انسان میری نگاہ کے سامنے تھا، اور دل نے محسوس کیا کہ اس دلکش جسم میں ایک لطیف روح بھی ہے، ان کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور چہرہ پر بزرگی اور تمکنت کے آثار نظر آئے، حضرت سید صاحب نے اٹھ کر ان سے معانقہ کیا، اور جب دونوں میں باتیں شروع ہوئیں تو مجلس کے اور شرکاء خاموشی سے سننے لگے، میں بھی ایک گوشہ میں بیٹھ کر اپنی آنکھوں سے اپنی جنت آرزو کی سیر کرنے لگا، دونوں بزرگ مختلف علمی، مذہبی اور

سیاسی مسائل پر گفتگو کر رہے تھے جس کو میں اچھی طرح سمجھنے سے قاصر تھا، لیکن اس صحبت کی لذت آج تک یاد ہے، اور جب کبھی اس کو یاد کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ایک برج میں دو قمر کو دیکھ رہا تھا، اس مجلس میں ان بزرگوں کا جو احترام ہو رہا تھا، اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اہل علم ہونا کتنی قابل قدر چیز ہے، اور معاً یہ خواہش بھی ہوئی کہ کاش میں بھی ان بزرگوں کی خاک پا ہوتا،

اس ملاقات کے ایک طویل عرصہ کے بعد جب میں اسکول کی تعلیم ختم کرکے کالج میں پڑھ رہا تھا، ایک دن خبر ملی کہ مولانا حیدرآباد سے آئے ہیں اور علاج کے لیے پٹنہ کے اسپتال میں داخل ہیں، اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ مجھکو اپنی طرف کھینچ کر اسپتال بلا رہے ہیں، گو اب تک میرا تعارف ان سے نہیں ہوا تھا، لیکن میں ان کی زیارت کے لیے اسپتال پہنچ گیا، ان کی عیادت کے لیے اور لوگ بھی آئے ہوئے تھے، میں ان کے کمرہ میں جاکر ایک گوشہ میں کھڑا ہو گیا، اور ان کو دیکھتا رہا، ان کا کوئی اپریشن ہوا تھا جس کی تکلیف سے نڈھال تھے لیکن مجھکو ان کے شرف دیدار سے بڑی تسکین ہوئی، مگر ان سے مخاطب ہونے کی جرأت نہ کر سکا، اور تھوڑی دیر ٹھہر کر خاموشی سے باہر چلا آیا، اس طرح کئی دن برابر اسپتال گیا اور صرف انکو دیکھ کر لوٹ آتا، اور اسی میں اپنی سعادت سمجھتا رہا، اور ان کے لیے دل سے دعائیں نکلتی رہیں، اور جب وہ شفایاب ہو کر اسپتال سے چلے گئے تو مجھکو بھی بڑی مسرت ہوئی،

طالب علمی ہی کے زمانہ میں ایک روز سننے میں آیا کہ مولانا نے اپنے نانہال استھانواں میں ایک پرزور تقریر کی ہے، اور اس میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے محض معاصرانہ چشمک کی بنا پر ان کی بعض تصانیف پر اعتراضات اور ان کے بعض اشعار پر نکتہ چینی کی ہے، مگر میرا دل اس کو قبول کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھا، لیکن کچھ لوگ اس واقعہ کو ہوا دیتے رہے،

اور اس کی خبر حضرت سید صاحب تک بھی پہنچائی، اور اس کا ذکر نجی صحبتوں میں بھی برابر جاری رہا، اتفاق سے اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد مارچ ۱۹۲۹ء میں مولانا کا ایک مضمون "حضرت حکیم مولانا سید برکات احمد ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ" کے عنوان سے معارف میں چھپا، اور اس کو حضرت سید صاحب نے سر مقالہ شائع کیا، اس کو دیکھ کر معاً یہ خیال آیا کہ دونوں بزرگوں کے دل ایک دوسرے سے بالکل صاف ہیں، ان میں خواہ مخواہ بدگمانی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی،

اس مقالہ میں مولانا نے اپنے دادا مولانا محمد احسن کا ذکر مولانا برکات احمد کے والد حکیم دائم علی کے استاد کی حیثیت سے کیا تھا، معارف کے ناظرین کی یاد تازہ کرنے کے لیے وہ سطریں یہاں نقل کی جاتی ہیں جن سے مولانا کے خاندان سے متعلق کچھ مفید معلومات بھی حاصل ہو جائیں گی،

"...... سیدوں کی ایک بستی گیلانی ہے، اس زمانہ میں وہاں کسی سرخ و سفید عمارت میں نہیں، ہزاروں روپے کے فرنیچر کے درمیان نہیں، بلکہ ایک خام مسجد کے کنارے برگد کے درخت کے نیچے کھلے ہوئے تخت پر گذشتہ خاک نشینوں کی ایک یادگار صرف حاضری کے رجسٹروں کی تکمیل نہیں کر رہا تھا، بلکہ ایک طرف ہدایہ اور تلویح، دوسری طرف حمد اللہ اور افق المبین جیسی سنگلاخ کتابوں سے لطیف حقائق اور دقیق نکات و مسائل کے جھرنے جاری کر رہا تھا، وہ کسی وقت اگر منطق و مابعد الطبیعیات کے رموز اور پیچیدہ غوامض پر شستہ تقریر کرتا تھا تو دوسرے وقت قاضی بیضاوی کی تفسیری اسرار اور تفتازانی کے بیانی و بدیعی نظرات کو مفت بانٹ رہا تھا، ان کا نام مولانا محمد احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ تھا، جو اپنے وقت میں صوبہ کے سرآمد روزگار فضلاء میں شمار کیے جاتے تھے، اور جن کی تہذیب و تدوین تحشیہ و تصحیح سے طوسی کے اقلیدس کا پہلا مقالہ عربی

مدارس میں اس وقت تک پڑھایا جاتا ہے"۔

میرے دل پر مولانا کی خاندانی عظمت کا نقش پہلے ہی سے تھا، مندرجہ بالا سطور پڑھ کر اور بھی گہرا ہوگیا،

اب مولانا کی علمی شہرت روز بروز بڑھتی جارہی تھی، اور ان کا ذکر ایک شیریں بیان مقرر، جید عالم، لائق معلم اور زود نویس اہل قلم کی حیثیت سے برابر سنتا رہا،

اس کے بعد ۱۹۳۱ء میں مولانا محمد علیؒ کی وفات پر ان کا مرثیہ پڑھ کر میرا دل انکی طرف اور مائل ہوگیا، مولانا محمد علی مرحوم سے مجھکو بڑی عقیدت تھی، ان کو محبت و اخلاص ہمت وجرأت، جوش وعمل، ایثار و قربانی، جانبازی و سرفروشی، رواداری اور حب الوطنی کا بہت بلند نمونہ سمجھتا تھا، ان کی قدر اس لیے بھی زیادہ دل میں تھی کہ اگر ایک طرف وہ اعلیٰ کردار کے محب وطن تھے، تو دوسری طرف شیردل مسلمان بھی، اگر غلامی کی زنجیر توڑنے کے لیے ہر سیاسی تحریک میں پیش پیش رہے، تو ساری عمر توحید کے فدائی اور شمع رسالت کے پروانہ بھی رہے، ان کی موت پر سارا ہندوستان سوگوار تھا، دنیا کے گوشہ گوشہ سے ان کے ماتم و شیون کی صدائیں بلند ہوئیں، مشہور انگریز مصنف ایچ۔ جی ویلز نے ان کی رحلت سے متاثر ہوکر یہ کہا تھا کہ ان کا دل نپولین کا تھا، ان کی زبان برک کی تھی، اور ان کا قلم میکاولے کا تھا، اور اس وقت کے وزیر ہند مسٹر بن نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ ایک جلیل القدر مسلمان، ایک زبردست محب وطن، اور عام انسانیت کے ایک عظیم المرتبت پیغمبر تھے،

لیکن ان بیانات کو پڑھ کر مولانا محمد علی کے فدائی کی حیثیت سے پندار تو ضرور محسوس ہوتا، لیکن غمناک جذبات کی تسکین نہ ہوئی، مگر ان پر جب مولانا مناظر احسن کا مرثیہ شائع ہوا، تو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے جراحت دل پر مرہم رکھدیا ہے، اس کو بار بار پڑھ کر دل کو تسکین دیتا،

ناظرین بھی اس سے محظوظ ہولیں۔

بدین مصطفیٰ دیوانہ بودی — فدائے ملت جانانہ بودی
بہ بزم ما رئیس عشقبازاں — بہ رزم دشمناں فرزانہ بودی
بہ دل بودی فقیرے بے نوائے — بہ قالب پیکر شاہانہ بودی
سیاست را نقاب چہرہ کردی — وگرنہ عاشق مستانہ بودی
سیاست تہمتے بعشق پاکت — ز آئین خرد بیگانہ بودی
بایمانہا نہ زورے و شورے — بجانہا ہمت مردانہ بودی
چہ دانستی کجا سوزم نہ سوزم — تو شمع دین را پروانہ بودی
رسیدی از رہ اغیار تا یار — عجب مستے عجب دیوانہ بودی
چہ آمد بر سر رنداں کہ آں را — خم و خمخانہ و پیمانہ بودی

ان ہی دنوں یہ روایت ملی تھی کہ مولانا جب حیدرآباد کے ایک تعزیتی جلسہ میں یہ مرثیہ پڑھنے لگے تو خود دھاڑیں مار کر رونے لگے، حالانکہ ان کا خود بیان تھا کہ وہ نہ کبھی مولانا محمد علی سے ملے تھے، اور نہ ان کو دیکھا تھا، لیکن ان سے غیر معمولی محبت رکھتے تھے، جو ان کے دردمند او حساس دل کے مالک ہونے کی دلیل تھی،

تعلیم ختم کرنے کے بعد جب میں دار المصنفین آیا تو ایک روز حضرت سید صاحبؒ کی ڈاک میں مولانا کا رسالہ "النبی الخاتم" دیکھ کر بڑے شوق سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا، اسکے دیباچہ میں حسب ذیل سطروں پر نظر پڑی:

"علامہ شبلی مرحوم اور ان کے جانشین برحق مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اردو زبان کو مضامین سیرت طیبہ سے مالا مال کردیا ہے،

تا اینکہ دوسری اسلامی زبانوں کو بھی اردو کی اس جامع، شگفتہ، اور مستند کتابوں کا ترجمہ کرنا پڑا":

اس کو پڑھ کر یہ غلط فہمی بالکل جاتی رہی کہ مولانا کو حضرت سید صاحبؒ سے معاصرانہ چشمک ہے، اور اس پر سید صاحبؒ نے معارف میں ایک بہت اچھا ریویو شائع کرایا جو حسب ذیل ہے:

"النبی الخاتم ...... ایک گلدستۂ عقیدت ہے، جسے مولانا مناظر احسن کے عقیدت مند قلم نے سجایا ہے، اس میں مولانا نے اپنے خاص والہانہ رنگ میں سیرتِ پاک کے واقعات کو ایک خاص انداز اور ترتیب کے ساتھ پیش کر کے نہایت لطیف نتائج پیدا کیے ہیں، اس حیثیت سے یہ اپنے طرز میں منفرد ہے کہ تاریخی واقعات کو وارفتگیٔ بیان کے ساتھ اس طرح نبھایا گیا ہے کہ ناقد مورخین اور ارباب وجد وحال دونوں اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اٹھا سکتے ہیں، زبان صاف و سادہ لیکن صنائع لفظی سے مالامال ہے"۔

خود مولانا اپنی تمام تصانیف میں اسی کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے، حضرت سید صاحبؒ نے نجی صحبتوں میں بھی اس رسالہ کی تعریف کی، اور جب مولانا کا ذکر آتا تو ان کے شیریں اخلاق، میٹھی میٹھی باتوں اور لطائف وظرائف کو بڑے لطف سے بیان کرتے، جس سے ثابت ہوتا تھا کہ دونوں کے درمیان معاصرانہ چشمک کی روایت سراسر غلط ہے بلکہ دونوں کے درمیان اخلاص و محبت کی نہریں رواں ہیں، دونوں میں خط و کتابت بھی رہتی تھی، مولانا سید صاحب کو کبھی "سید الامام" کبھی "سیدی" اور "سید المرسلین" لکھ کر مخاطب فرماتے، اور اس طرح خط لکھتے جیسے کوئی چھوٹا عزیز اپنے کسی بہت ہی شفیق بزرگ کو لکھتا ہے، کسی میں ان کی علمی

کمال اور ادبی فضیلت کا اعتراف کرتے، کسی میں ان کی کسی تصنیف یا مضمون کی داد دیتے، کسی میں ان کے ذاتی اوصاف مثلاً روحانیت، حلم، بردباری، لینت، شرافت کا ذکر کرتے اور غایت انکسار میں اپنے کو محض مورِ ضعیف ہی ثابت کرنے کی کوشش کرتے، حضرت سید صاحب نے بھی ان کو "محب اعز واعز" لکھ کر اپنا مکتوب شروع کرتے، اور دونوں اپنے خطوط میں علمی مسائل کے علاوہ خانگی و نجی باتوں سے متعلق بھی ایک دوسرے سے مشورے کرتے رہتے اور مجھ کو اندرونی طور پر خوشی ہوتی کہ دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب تر ہیں،

۱۹۳۰ء سے پہلے مولانا نے تین رسالے لکھے تھے، **روحانی کائنات، حضرت ابوذر غفاریؓ**، اور **النبی الخاتمؐ**۔ یہ راقم اپنی علمی بے مائگی کی وجہ سے ان سے اتنا لطف اندوز نہ ہو سکا جتنا کہ ہونا چاہیے تھا، لیکن ۱۹۳۶ء میں جب الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر شائع ہوا، اور اس میں مولانا کا مضمون "الف ثانی (یا ہزارہ دوم) کا تجدیدی کارنامہ" پڑھا تو ایسا معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مغلیہ عہد کی تاریخ کی تمام گرہیں کھل گئیں، راقم کا خاص موضوع ہندوستان میں اسلامی عہد کی تاریخ رہا ہے، اس مضمون کو پڑھنے کے بعد تیموری دور کی تاریخ سمجھنے میں ایک خاص زاویۂ نظر ملا، دین الٰہی پر مضامین برابر پڑھتا رہا تھا، ملا عبد القادر بدایونی کی منتخب التواریخ جلد سوم میں تو اس کی تفصیل ملتی ہے، جو چار سو صفحوں میں انتہائی بے ترتیبی کے ساتھ منتشر ہے، مولانا نے پہلی دفعہ ترتیب و تنظیم کے ساتھ اکبر کی اس بدعت سیئہ کا احاطہ کیا، اس لیے مجھ پر ان کی عالمانہ تحقیق و تنقیح کا بڑا گہرا اثر پڑا، ان مباحث کی تعلیل و توجیہ کے سلسلہ میں جو موشگافیاں انھوں نے کی ہیں، ان سے ان کی غیر معمولی ذہانت اور ذکاوت کا اندازہ ہوا، اس مضمون نے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ آخر کیا بات تھی کہ اکبر نے دین الٰہی تو قائم کیا، لیکن جہانگیری عہد سے پہلے یہ آپ اپنی موت مر گیا۔

اور پھر شاہجہانی عہد میں اسلام اور اسلامی روایات کی جو تجدید شروع ہوئی تو عالمگیر کے عہد میں انتہا کو پہنچ گئی، اور گو غیر مسلموں کے نزدیک آج عالمگیر اور تعصب مترادف الفاظ بن گئے ہیں، لیکن اسی مضمون کو پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر اکبر نے دین الٰہی کے ذریعہ اسلام اور شعائر اسلام کی توہین و تحقیر بلکہ بیخ کنی نہ کی ہوتی تو شاید ہندوستان کی تاریخ میں کوئی عالمگیر نہ پیدا ہوتا، اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آئندہ بھی جب کوئی اکبر پیدا ہوگا تو کچھ عرصہ کے بعد کوئی عالمگیر بھی ضرور افق پر نمودار ہوگا، مولانا نے اپنے مقالہ میں یہ پوری طرح واضح کیا ہے کہ رواداری کے نام پر اکبر نے جو پالیسی اختیار کی تھی وہ دراصل ارتداد، الحاد اور بے دینی تھی، جو اکبر کے بعد بھی مختلف شکلوں میں ابھرتی رہی، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے پیرو اس کو مٹانے کی کوشش میں لگے رہے، یہاں تک کہ ملک ذہنی حیثیت سے دو جماعتوں میں تقسیم ہو گیا، ایک نے اکبر کے روحانی جانشین دارا کی تائید کی، اور دوسری نے عالمگیر کی حمایت کی، دارا شکوہ اکبر کی روایت کو زندہ کرنا چاہتا تھا، اور عالمگیر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تجدیدی کارناموں کو روشن رکھنا چاہتا تھا، اس لیے دارا اور اورنگ زیب کی جنگ گو بظاہر تخت و تاج کی لڑائی تھی لیکن دراصل دو نظریوں اور دو تحریکوں کا تصادم تھا، ایک کا سلسلہ اکبر سے ملتا تھا، اور دوسرے کا حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات سے شروع ہوتا تھا، کیونکہ عالمگیر حضرت مجددؒ کے صاحبزادے حضرت میر معصوم کے حلقۂ ارادت میں بھی داخل تھا، اور اس کے سیاسی کاموں میں حضرت معصوم کے مشوروں کو بڑا دخل رہا ہے، جیسا کہ ان کے مکاتیب سے پتہ چلتا ہے، اور بقول مولانا مناظر احسن گیلانی جس تجدیدی عمل کی ابتدا جہانگیر سے ہوئی، اس کا انتہائی کمال عالمگیر کی ذات پر ہوا، ایک بار حضرت سید صاحب نے راقم سے فرمایا تھا کہ دارا شکوہ تخت پر بیٹھتا تو مسلمانوں کی سلطنت تو باقی رہتی لیکن اسلام ختم ہو گیا ہوتا، عالمگیر کے تخت پر

بیٹھنے سے اس کے بعد مسلمانوں کی سلطنت تو باقی نہیں رہی، لیکن اسلام باقی رہا، اس اجمال کی تفصیل سمجھنے میں مولانا کے مضمون سے بڑی مدد ملی، اور سچ تو یہ ہے کہ تیموری دور کی تاریخ کا صحیح جائزہ اس وقت تک نہیں لیا جا سکتا، جب تک کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے معتقدین کے کاموں کا گہرا مطالعہ نہ کیا جائے، مولانا نے اپنے مضمون میں ان ہی تاریخی رموز و نکات کی موشگافی کی ہے،

کچھ ہی عرصہ کے بعد ان کا ایک طویل مضمون حضرت شاہ ولی اللہ پر الفرقان کے ولی اللہ نمبر میں شائع ہوا، اس کو پڑھ کر ایک بار پھر تاریخ ہند پر ان کی گہری نظر کا اندازہ ہوا، اس میں انھوں نے مورخانہ بصیرت کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد میں کس طرح اسلام پر تاریک بادل چھایا ہوا تھا، ہندوستان کے شمالی علاقوں میں سکھوں کی قوت ابھر رہی تھی، جنوبی ہند میں مرہٹوں کی طاقت کا سیلاب بڑھتا جا رہا تھا، خلیج بنگال کے ساحلی علاقوں سے یورپین ممالک کی طاقتیں ہندوستان پر للچائی ہوئی نظریں ڈال رہی تھیں، اور خود مسلمانوں کے اندر ایرانیوں، تورانیوں اور روہیلوں کے باہمی تصادم سے اسلامی حکومت کی قبا تار تار ہو رہی تھی، بعض صوفیہ کے غلط تصوف اور فقہا کے غلط تفقہ سے امت کے شیرازے میں انتشار پھیلا ہوا تھا، خود ہندوستانی علماء کا طبقہ قرآن و حدیث کی اصلی تعلیم، اصول و فقہ اور عقائد و کلام سے ہٹ کر لاطائل ذہنی اور لفظی مباحث میں الجھا ہوا تھا، اس تجزیہ میں بھی مولانا کی غیر معمولی مورخانہ ذہانت و ذکاوت کا رنگ نمایاں تھا، اور بعض مواقع پر اس لیے بھی حیرت ہوتی کہ ایک ایسے اہل قلم کی نگاہ جس کی تعلیم صرف عربی مدارس میں محدود رہی، کیسے ان باریک گوشوں تک پہنچی، اس لیے اکثر یہ خیال آیا کہ اگر ان کی تعلیم خالص انگریزی طرز کی ہوتی اور وہ اپنا موضوع صرف تاریخ ہند ہی بنا لیتے تو شاید ان کے پایہ کا کوئی مورخ

ہندوستان میں نہ ہوتا، مولانا کی نظر ہندوستان کے سیاسی واقعات کے ساتھ مذہبی رجحانات، تحریکات اور انقلابات پر بھی تھی، اس لیے ان کے نقد و تبصرہ میں بڑی جامعیت ہوتی تھی، جو تاریخ ہند پر دوسرے لکھنے والوں کو میسر نہیں، اسی مضمون میں انھوں نے شاہ ولی اللہ کی سیاسی، دینی اور علمی خدمات کی جو تفصیل بتائی ہے، اس کا اندازہ اہل نظر اور اہل فکر ہی کر سکتے ہیں، پھر اس کے لکھنے میں ان پر جو ایک "حال" اور "وجد" طاری ہے، وہ لائق مطالعہ ہے، ان کا سینہ دینی و ملی احساسات سے معمور نظر آتا ہے، اور مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت کے لکھنے میں ان کے قلم سے جو تحریر نکلی ہے، وہ دراصل ان کے سینہ کے آبلے ہیں، جو کاغذ کے صفحات پر پھوٹ پھوٹ کر بہہ نکلے ہیں، یہ مضمون ایک علیحدہ کتاب **آغوش موج کا ایک در تابندہ** کے نام سے بھی شائع ہو گیا ہے،

۱۹۳۵ء کے دسمبر میں میرے وطن میں بعض اعزۂ خاص کے یہاں تقریبات تھیں، جن میں شرکت کے لیے میں بھی اعظم گڈھ سے گیا تھا، مولانا بھی گیلانی سے تشریف لائے تھے، اور قبل اس کے کہ میں ان کی قدم بوسی کروں، ایک موقع پر میں نے محسوس کیا کہ میرے کاندھے پر کسی کا ہاتھ ہے، اور اسی کے ساتھ ہی آواز بلند ہوئی "السلام علیکم عزیزم!" میں نے پلٹ کر دیکھا تو مولانا تھے، حیدر آبادی شروانی میں ملبوس تھے، سر پر حیدر آبادی رومال تھا، میں کچھ گھبرا سا گیا، انھوں نے از راہ لطف و کرم معانقہ فرمایا، اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر الگ لے گئے، میرے سامنے اس وقت ایک منور چہرہ تھا، جس پر نرمی، شگفتگی، پاکیزگی اور برگزیدگی برس رہی تھی، ان کا نورانی چہرہ دیکھ کر دل کہتا تھا کہ ان کے قلب میں شاید معصیت کا وسوسہ بھی کبھی پیدا نہ ہوتا ہوگا، داڑھی سفید ہو چکی تھی لیکن چہرہ پر اس طرح زیب دیتی تھی جیسے اسی کے لیے بنائی گئی ہو، آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں لیکن ان میں ذہانت، مہر اور محبت کی تابانی تھی، دار المصنفین کے

حالات پوچھتے رہے، اور یہاں کے ایک ایک فرد کے متعلق سوالات کیے، ان ہی دنوں ہندوستان کی تاریخ سے متعلق میرے کچھ مضامین معارف میں شائع ہوئے تھے، ان کا ذکر کر کے ہندوستان کی تاریخ پر ایسی عالمانہ اور دلکش گفتگو شروع کر دی کہ مجھ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شربت کے گھونٹ میرے حلق سے اتر رہے ہیں، مہا بھارت، رامائن، گیتا، البیرونی، ابن بطوطہ، ضیاء الدین برنی پر ایسی مبصرانہ گفتگو سنی کہ مجھ کو حیرت ہو رہی تھی کہ میں کسی عالم دین یا دینیات کے معلم کے سامنے ہوں یا تاریخ کے کسی ماہر کے پاس بیٹھا ہوں، وہ بات کرنے میں ہاتھوں کو تیزی سے حرکت دیتے تھے، جو ان کے لطف بیان پر مہمیز کا کام دیتے تھے، کبھی کبھی وہ آنکھوں کو بند کر لیتے اس وقت شاید وہ اپنی دوربین نگاہوں کو اس مقام پر پہنچا دیتے جہاں ایک عام اہل علم کی نگاہ کا پہنچنا ممکن نہ تھا، ان کی آواز میں اتار چڑھاؤ تو مطلق نہ تھا لیکن بڑی شیرینی اور حلاوت تھی، تنہائی کی یہ صحبت دیر تک نہیں رہی، کیونکہ ان کی باتیں سننے کے لیے کچھ اور ہم وطن بھی آ گئے، اور ان کو موضوع سخن بدلنا پڑا، مگر وہ جب تک علمی گفتگو کرتے رہے، میں ان کے فکر و نظر کی گہرائی میں کھویا ہوا محو حیرت بنا رہا، اور ان کی نکتہ رسی اور مجتہدانہ طریقۂ فکر کے بوجھ سے دبا چلا گیا، اس صحبت میں ان کے کچھ ایسے رشتہ دار بھی شریک تھے، جن سے سالے بہنوئی کا رشتہ تھا، اس وقت مولانا خالص بہاری بن گئے، اور یہ مجلس بے تکلفانہ فقرہ بازیوں، غیر ثقہ جملوں، قہقہوں اور چہچہوں سے گونجتی رہا، اور مولانا نے اس وقت کسی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ اہل علم بھی ہیں،

ان کا قیام اس تقریب میں دو دن رہا، دونوں دن برابر ان سے ملنے کی سعادت حاصل رہی، ایک موقع پر ان کی خدمت میں تفریحاً عرض کیا کہ آپ کے نام کے ساتھ گیلانی دیکھ کر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا مولانا حضرت عبد القادر جیلانیؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، یہ سنکر

ہنسنے لگے، اور فرمایا "گیلانی کی نسبت سے مجھکو گیلانوی لکھنا چاہیے تھا، لیکن شافعی امام شافعی کے ساتھ نسبت ہے، شافعی اپنے کو شافعوی نہیں لکھتے، پھر اگر میں گیلانی لکھتا ہوں تو اس میں کیا ہرج ہے؛ یہ بھی فرمایا کہ اکبر کے عہد میں صدر پہانی ایک بزرگ گزرے ہیں، ان کا ذکر ملا عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں کیا ہے، وہ ایک گاؤں پہانی کے رہنے والے تھے، اور پہانوی کے بجائے پہانی کہلاتے تھے، یہ نکتہ آفرینی سنکر مجھکو ہنسی آگئی، اتفاق سے ان کی رحلت کے بعد ان کے کاغذات میں بھی اسی قسم کی ایک تحریر دیکھی، وہ اپنی ذہانت سے روزمرہ کی معمولی سی معمولی باتوں میں بڑے بڑے علمی نکتے پیدا کرتے رہتے تھے،

اسی قیام کے دوران میں حضرت سید صاحبؒ کا ذکر بار بار آیا، اور مولانا ان سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرتے رہے، ایک موقع پر فرمایا کہ میں سید صاحب کی تصانیف کو اس لیے پسند کرتا ہوں کہ ان سے نئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، جو علمی باتیں پہلے مجمل شکل میں تھیں، سید صاحب کی تحقیق و تدقیق نے ان کو زیادہ مفصل بنا دیا، اور پھر اپنے داہنے ہاتھ کو زور سے حرکت دیتے ہوئے کہا کہ ان کی علمی کاوش اور محنت کی داد دینے میں بخل کرنا نہ صرف تعصب و تنگدلی بلکہ ایک قسم کی عقلی و طبعی دناءت ہے، یہ سنکر مجھکو اور زیادہ انشراح ہوا کہ وہ لوگ کیسے تنگ نظر تھے، جو ان پر سید صاحبؒ سے معاصرانہ چشمک کا الزام رکھتے تھے، مولانا نے جب جب سید صاحبؒ پر کوئی مضمون لکھا، ان کے علمی کمالات کی داد دل کھول کر دی، اور جو گفتگو میں نے ان کی زبان سے سنی تھی، اس کی تفصیل مولانا کے ایک طویل مقالہ "مولانا سید سلیمان ندوی کا پہلا کارنامہ" کے عنوان سے سنہ ۱۹۴۰ء کے معارف کے پانچ نمبروں میں پڑھی، اس کی ابتدا ہی میں ارقام فرماتے ہیں:

"نئے حالات نے جدید ذہنیتوں میں جن نئی نئی الجھنوں کو پیدا کر دیا تھا، خدا ہی جانتا ہے کہ

اعظم گڈھ کے اس زاویہ نشین درویش کے قلم نے ان کی گرہ کشائیوں میں کتنی جلیل و عظیم خدمتیں دی ہیں"

اسی مضمون میں انھوں نے حضرت سید صاحب کی علمی و تحقیقی کاوشوں کی جس قدر تعریف کی ہے، وہ کسی عالم نے اپنے کسی معاصر عالم کے لیے شاید ہی کی ہو،

سنہ ۱۹۴۰ء کے بعد وہ علمی دنیا کی فضا میں ہر طرف چھائے ہوئے تھے، معارف، برہان، الفرقان، مجلہ عثمانیہ، عثمانیہ یونیورسٹی کے اسٹاف کے میگزین، ندیم، صدق وغیرہ ان کے قلم کی بارش سے سیراب ہو رہے تھے، اور ان کے مضامین کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ کبھی عالم، کبھی متکلم، کبھی فقیہ، کبھی محدث، کبھی مفسر، اور کبھی مورخ کے رنگارنگ جلووں میں نظر آتے تھے،

سنہ ۱۹۴۱ء میں ادارۂ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ کی طرف سے ان کا ایک طویل مضمون کتاب کی صورت میں **تدوین فقہ** کے نام سے شائع ہوا، پھر اسی ادارہ کی طرف سے ان کی کتاب **تدوین حدیث** کی اشاعت ہوئی، میں نے جب جب ان دونوں کتابوں کے پڑھنے کی کوشش کی تو اپنے کو ان کی فکر و تحقیق کے دریا میں غرق پایا، البتہ ان کی اہمیت حضرت سید صاحب کی گفتگوؤں اور تحریروں سے معلوم ہوئی کہ ہر زمانہ میں کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہوتے رہے ہیں جو عقائد میں کتربیونت کر کے نئے اسلام کی دعوت دیتے رہے ہیں، لیکن خدا کے کچھ ایسے بندے بھی افق پر نمودار ہوتے رہے ہیں، جنھوں نے اپنی اہلیت و استعداد سے ان بدعات کے گرد و غبار کو ہٹا کر اسلام کے منور آئینہ کو روشن رکھا، مولانا کی مذکورۂ بالا کتابیں دراصل ایسے ہی بدعتیوں کے مقابلہ کے لیے لکھی گئیں، ان کی تدوین حدیث پر سید صاحب نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ

اللہ کے مخصوص بندوں نے ایسے بدعتیوں کے ہر تیر کو اپنے سپر سے روکا، اور ان کے ہر اعتراض کو دور کیا، اور ان کے ہر شبہہ کو رفع کیا، اور پھر اسی سلسلہ میں حضرت سید صاحبؒ نے تحریر فرمایا کہ

"اس زمانہ میں اس فرض کو ادا کرنے کے لیے جو دستہ آگے بڑھا، اس کے ہراول میں ہمارے دوست مناظر اسلام، متکلم ملت، سلطان القلم مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی (متع اللہ المسلمین بطول بقائہ) کا نام نامی ہے، جن کے قلم کی روانی اسلام کی محافظت میں تیغ رانی کا کام دیتی ہے، وہ ہر سال اور سال کے مختلف حصوں میں اپنی تحقیقات علمیہ کے بلند نمونے پیش کرتے رہتے ہیں، اور خصوصاً اپنے توسیعی خطبات اور اپنے تلامذہ کے امتحانی مقالات کے پردے میں علم اور دین کی ایسی خدمتیں انجام دے رہے ہیں جو سارے مسلمانوں کی تحسین اور شکریہ کی مستحق ہیں۔"

ان سطروں میں نہ صرف حقیقت و اصلیت کا اظہار ہے، بلکہ مولانا کی علمی فضیلت و عظمت جو حضرت سید صاحب کے دل میں تھی، اس کا بھی پورے اخلاص کے ساتھ اعتراف ہے،

سنہ ۴۳ء میں دفتر الفرقان بریلی سے ان کا ایک رسالہ الدین القیم شائع ہوا، جس میں مولانا نے صوفی اور متکلم بن کر "صوفیانہ علم کلام" پیش کیا تھا، اور وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے مباحث کے ذریعہ کائنات کے اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کی تھی جس کو عقل اور فلسفہ حل کرنے سے عاجز رہا،

اسی سال ان کی ایک ضخیم کتاب **ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت** حصہ اول (ضخامت ۴۸۶ صفحے) ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی، یہ کتاب بھی عجیب و غریب ہے، اس کا موضوع نام سے ظاہر ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس میں ابواب یا بغلی سرخی قائم کرنے کی کوشش کرے تو اس کے بس کی بات نہ ہوگی، بلکہ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب ناظم ندوۃ المصنفین

اس کو شائع کرتے وقت اس کے مضامین کی فہرست بھی ترتیب دینے سے قاصر رہے، اور ان کو شروع میں محض چند عنوانات کی فہرست ہی دینے پر اکتفا کرنا پڑا، اس کتاب میں مولانا مسلمانوں کے نظامِ تعلیم، نصاب تعلیم، طریقۂ درس، طلبہ کے قیام و طعام اور اخلاق وغیرہ پر لکھنا چاہتے تھے، لیکن ان کا قلم بقول حضرت سید صاحبؒ "منطقی ترتیب" اور "مصطلحہ تصنیفی رسوم" کے بجائے افادیت کا خوگر تھا، اس لیے کتاب میں ایسے ضمنی مباحث بھی بکثرت آگئے ہیں، جن کا تعلق موضوع سے تو نہیں ہے، لیکن وہ بجائے خود مفید ہیں، مولانا خود اس کتاب کے دیباچہ میں ارقام فرماتے ہیں،

"دار العلوم دیوبند کے مجلہ شہریہ دار العلوم کے مدیر کا عنایت نامہ آیا کہ مضمون لکھ کر بھیجدو، دار العلوم ایک تعلیمی ادارہ ہے، اسی مناسبت کا خیال کرکے چار پانچ صفحوں کے مختصر مضمون کا ارادہ کرکے میں نے نامور علی آزاد بلگرامی مرحوم کی کتاب مآثر الکرام کو الٹنا پلٹنا شروع کیا، بعض کارآمد اور دلچسپ باتیں ہاتھ آئیں، قلم اٹھایا لکھنا شروع کیا، اب میں نہیں بتا سکتا کہ پھر کیا ہوا، قلم رواں ہوا، چلا، چلتا گیا، بات میں بات کا خیال آتا جاتا تھا، اور لکھتا جاتا تھا، پانچ صفحوں کے لکھنے کے لیے بیٹھا تھا، وہی اس وقت ۷۵۰ صفحات کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے۔"

اور پھر یہ پڑھکر اور بھی حیرت ہوئی کہ یہ سات سو پچاس صفحے کل بیس دن کی مدت میں لکھے گئے، فرماتے ہیں:

"بچوں کو مسلم الثبوت، ہدایہ، بخاری اور ترمذی جیسی درسی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے والے سے کسی تاریخی مضمون کی توقع بھی نہ کرنی چاہیے، وہ بھی کل بیس دن کی یہ محنت ہے، طلبہ امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہیں، اسی میں کچھ فرصت ہمدست ہوئی، لکھتا چلا گیا اور اسی مسودہ کو پریس میں بھیج رہا ہوں۔"

قلم کی اس برق رفتاری اور علم کی اس صاعقہ پاشی کی مثال کم ملے گی !! عہد ماضی کے تعلیمی نظام کے لکھنے میں ان کے ذاتی خیالات بھی بے چین ہو ہو کر قلم سے ٹپکتے چلے گئے ہیں، اور یہ ذاتی خیالات زیادہ تر اس ناوک فگنی کا ردعمل ہے، جس کا ہدف مسلمانوں کا مذہبی تعلیمی نظام رہا ہے، جیسا کہ خود مولانا کا بیان ہے کہ ان ٹیسوں اور ہوکوں کی بے چینیاں ہیں، جو ان تیروں کے زخموں نے ان کے دل میں پیدا کر دی تھیں، اس کے دیباچہ کے حسب ذیل فقروں کے پڑھنے کے بعد اس کے مطالعہ کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے، اور اس کے پڑھنے میں ایک کیف محسوس ہونے لگتا ہے،

"مجھے رلایا گیا ہے، تب رویا ہوں، ستایا گیا ہوں، تب کراہا ہوں، ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں بعض مواقع پر میرے نالے ذرا زیادہ بلند ہو گئے ہیں، قابو سے قلم کہیں باہر ہو گیا ہو اس میں مجھے معاف رکھا جائے۔"

جس سوز و درد کے ساتھ یہ کتاب لکھی گئی تھی، اس کے لحاظ سے اس کا مقبول ہونا لازمی تھا، حضرت سید صاحبؒ نے اس پر تبصرہ لکھتے ہوئے تحریر فرمایا تھا" ہمارے قدیم طریقۂ تعلیم اور اصول تعلیم پر اس سے زیادہ جامع کتاب نہیں"، افسوس ہے کہ اس کی دوسری جلد شائع نہ ہو سکی،

اس کتاب کے دیباچہ میں مولانا نے خود اپنے سے شکایت کی ہے کہ وہ عمل کی قوت سے تقریباً محروم ہو چکے ہیں، اور اب ان میں علمی کام کا نہ عزم ہے اور نہ ارادہ، لیکن ان کی طبیعت میں عجز و انکسار کچھ ایسا تھا کہ وہ اپنی نجی اور معاشرتی زندگی میں بھی اپنی جانب کسی وصف کا انتساب پسند نہ فرماتے تھے، مگر فقدان عزم کے اس اعتراف کے باوجود ان کے مضامین ملک کے علمی رسالوں میں برابر شائع ہوتے رہتے تھے، ۱۹۴۴ء میں ان کا ایک طویل مضمون "تذکرہ گیا" میں

"شاہ متکلم اسلام کی شان میں" نظر سے گذرا تو اردو شعر و شاعری میں بھی ان کے پاکیزہ ذوق اور ناقدانہ نظر کا اندازہ ہوا،

۱۹۴۷ء میں ان کی ایک ضخیم کتاب "اسلامی معاشیات" حیدر آباد سے شائع ہوئی جو بڑی تقطیع کے ۴۵۳ صفحے پر مشتمل ہے، اب تک اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب نہ تھی، اور غالباً عربی زبان میں بھی اس نوعیت کی کوئی تصنیف نہیں ہے، یہ مولانا کے اجتہاد اور انکی وسعت نظر کی دلیل ہے کہ انھوں نے اسلامی معاشیات پر ایک کتاب لکھ کر معاشیات کے دوسرے نظاموں کے مقابلہ میں اسلام کا ایک مستقل نظام پیش کر دیا، ممکن ہے کہ ان کی **اسلامی معاشیات** فنی حیثیت سے ماہرین کی نگاہوں میں اہم نہ ہو، لیکن اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ مولانا ہی نے اردو میں اسلامی معاشیات کے لٹریچر کی داغ بیل ڈالی، آگے چل کر اس موضوع پر بہت سی کتابیں شائع ہوں گی، اور اسلامی معاشی نظام کا ایک واضح اور روشن نقشہ لوگوں کے سامنے آئے گا، لیکن اس فن کی تعمیر کا معمار اول مولانا ہی کو تسلیم کرنا پڑے گا، کلام پاک کی ایسی آیتوں سے جن کی تلاوت ہم روزانہ کرتے ہیں، انھوں نے ایسے حقایق پیش کیے ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد ان کی غیر معمولی بصیرت اور ذہانت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے،

ابھی اس کتاب کا چرچا اہل علم کے حلقہ میں ہو ہی رہا تھا کہ کراچی سے ان کی ایک دوسری کتاب **حضرت امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی** شائع ہوئی، یہ بھی بڑی تقطیع کے ۳۹۹ صفحات پر مشتمل ہے، راقم اپنی نااہلی کی وجہ سے ان کی کسی کتاب پر علمی تبصرہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا، ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ وہی ارباب علم و نظر کر سکتے ہیں جو خود بھی مولانا کی طرح علوم و فنون کے بحر بیکراں کے شناور ہوں، لیکن ان کی کتابوں پر سرسری نظر ڈالنے سے

بھی یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کے قلم سے علم کا دریا بہہ رہا ہے، اور دریا کی موجوں کی طرح ان کی
تحریر میں اضطراب و تلاطم ہے، اور جس طرح دریا کی پرشور لہروں میں ہمواری نہیں ہوسکتی اسی
طرح ان کی پرزور تحریروں میں موضوع کے لحاظ سے ترتیب و تنظیم نہیں ہوتی، وہ خود ایک
مکتوب میں حضرت سید صاحبؒ کو لکھتے ہیں،

"ایک دفعہ جھونک میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو لکھتا چلا جاتا ہوں، پھر اس کی نظر ثانی
حک و اصلاح میرے لیے مشکل ہوتی ہے، میں چھاپنے والے پر چھوڑ دیتا ہوں کہ خرافات
کو حذف کرکے کارآمد اجزا کا انتخاب کرلیں۔"

لیکن جن چیزوں کو وہ خرافات سمجھتے تھے، وہ اب بیش بہا معلومات کا خزانہ معلوم
ہوتے ہیں، ان کے مضامین اور تصانیف میں موضوع سے غیر متعلق باتیں بکثرت ہوتی ہیں
جن سے ان کی تحریر میں بڑی طوالت پیدا ہوجاتی ہے، لیکن ان غیر متعلق باتوں میں بھی اتنے
کارآمد معلومات ہوتے ہیں، جو بہت سی کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کردیتے ہیں، پھر
تحریر کے آرٹ کے نقطۂ نظر سے یہ کہنا پڑے گا کہ وہ اطناب کے بادشاہ تھے، وہ کوزہ کے
چند قطروں کو اپنے سیال قلم سے سیلاب بنا دیتے تھے، اور ایسا کرنے میں ان کو کوئی غیر معمولی
محنت و مشقت نہ کرنی پڑتی، وہ جیسے بولتے تھے، ویسے ہی لکھتے تھے، اسی لیے ان کی تحریر
میں تکلف اور تصنع نہیں پایا جاتا، اگر ان سے ادنی سے ادنی آدمی بھی گفتگو کرتا تو اس میں
بھی اپنی ذہانت سے کوئی نہ کوئی عالمانہ یا معلمانہ نکتہ ضرور پیدا کردیتے، یہی حال ان کی تحریر کا تھا،
کہ بات میں بات پیدا کرتے چلے جاتے تھے، حافظہ بڑا قوی تھا، جو چیز کہیں ایک بار پڑھ لیتے
وہ ذہن میں محفوظ ہوجاتی تھی، اور جب لکھنے بیٹھتے تھے تو حافظہ اپنی پوری تحویل ان کے
حوالہ کردیتا، اور وہ ان سب کو اپنی تحریر میں سمیٹنے کی کوشش کرتے، اور ان کے سمیٹنے میں

ان کا قلم بالکل نہ تھکتا، اور جب ایک بار چل جاتا تو پھر نہ رکتا، افسوس ہے کہ ان کی صحت
نے ان کے قلم کا ساتھ نہیں دیا، ورنہ کمیت کے لحاظ سے کوئی معاصر اہل قلم ان کا مقابلہ نہیں
کرسکتا تھا، پھر بھی انھوں نے جس قدر لکھ دیا ہے، اس کی کیفیت سے وہی لطف اندوز
ہوسکتے ہیں جو خود بھی اہل نظر اور دیدہ ور ہیں، یہ ضرور ہے کہ ان کے مضامین میں تہذیب و
تنظیم کے بجائے ایک قسم کا انتشار ہے، جو دراصل ان کی علمی شوریدگی کا نتیجہ ہے، اس کے
باوجود ان کی کوئی تحریر ایسی نہیں جو فکر و نظر کی گہرائی اور وسعت سے خالی ہو، یا جس میں
ان کی غیر معمولی ذہانت اور بصیرت نمایاں نہ ہو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خالی اوقات
میں سوچا کرتے تھے، اور جب لکھنے بیٹھتے تو سفینہ ان کے علم سینہ کا متحمل نہیں ہوتا تھا،
وہ اپنے غور و فکر کے سارے نتائج کسی نہ کسی شکل میں ان لوگوں تک پہنچا دینے کی کوشش
کرتے تھے، جو فائدہ اٹھا سکتے تھے، علم کے ایک معلم سے یہی توقع کی جاتی ہے، اس لحاظ سے
وہ اپنے مضامین اور تصانیف میں عالم اور معلم دونوں نظر آتے ہیں، لیکن وہ ہمیشہ علم کی
عظمت و برگزیدگی کے قائل رہے، اس لیے اس کا کبھی "بیوپار"[1] نہیں کیا، وہ کتاب لکھ کر
ناشر کو دیدیتے، وہ چھپ کر دوسروں کے ہاتھوں میں پہنچ بھی جاتی اور ان کو خبر تک نہ ہوتی،
ان کو جب معلوم ہوتا تو کبھی ناشر کو لکھ کر منگواتے، یا کوئی لاکر دیدیتا تو دیکھ کر خوش ہوجاتے
کہ چھپ گئی، اور یہی ان کی ساری محنت کا صلہ ہوتا، معاوضہ یا رائلٹی قبول کرنا مطلق
پسند نہ کرتے تھے، اور پھر اپنے علمی کارناموں کے رد و قبول اور داد و تحسین سے بھی بے نیاز
تھے، ایک موقع پر راقم کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا،

"غریب مضمون نگاروں اور کتب سازوں کی محنت و زحمت کا اندازہ وہ

---

[1] یہ لفظ جناب رشید احمد صاحب صدیقی کے ایک مضمون سے مستعار ہے۔

طبقہ کیا کرسکتا ہے جو عرف پڑھ کر کتاب کو چھوڑ دیتا ہے، دس منٹ میں جو مضمون پڑھ
لیا جاتا ہے، بسا اوقات اس کی تیاری میں دس مہینے صرف ہوتے ہیں، اپنی کاریگری سے
کاریگر کو جو خوشی ہوتی ہے وہی کام کا کافی صلہ ہے۔"

اور غالباً وہ اردو کے تنہا مصنف ہیں جن پر کسی اہل قلم نے حریفانہ یا معاصرانہ تنقید یا
خردہ گیری کی جرأت نہیں کی، جو ان کے علمی اخلاص کی ایک بڑی دلیل ہے،

وہ بڑے شیریں بیان مقرر بھی تھے، یہ برابر خبر ملتی تھی کہ حیدرآباد میں عید میلاد النبی کے
موقع پر حضور نظام خاص طور پر ان کی تقریر سننے کے لیے شریک ہوتے ہیں، وہ اپنی تقریروں
میں بڑے دلچسپ قصے اور لطیفے بیان کرتے، جن سے سامعین بہت محظوظ ہوتے، ان کو واعظانہ
رنگ کے علاوہ تبلیغی، علمی اور کبھی کبھی سیاسی تقریر کرنے میں بڑی قدرت حاصل تھی، وہ اپنی
تقریر کی "متین شوخی" سے لوگوں کو ہنساتے تو اپنے عالمانہ استدلال اور عارفانہ نکتہ وری
سے ان کو متاثر بھی کرتے تھے،

دسمبر ۱۹۴۵ء میں وطن جاتے ہوئے بہار شریف پہنچا تو میرے پہنچنے سے ایک روز
پہلے وہاں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا سیاسی جلسہ تھا، اس میں مولانا کو تقریر کرنے کے لیے
خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا، میں تقریر سننے کی سعادت سے تو محروم رہا، لیکن ہر شخص کی زبانی
ان کی پرجوش تقریر کا ذکر سنا، اور پھر جب میں مولانا سے ملنے کے لیے حاضر ہوا تو ان کے
اردگرد بہت سے لوگوں کو پایا جو ان کی تقریر کی تعریف کر رہے تھے، مگر وہ اپنے مزاحیہ
انداز میں اس مدح سرائی کا موضوع بدل دینے کی کوشش کرتے، ان میں کبھی بھی تشخص پسندی
نہیں آئی، اسی لیے وہ اپنی فضیلت اور برگزیدگی کی داد لینے یا سننے میں ہمیشہ مستغنی اور بے نیاز
رہے، حالانکہ وہ خود ہم عصروں کے کمال کی داد دینے میں بڑے فیاض تھے، بلکہ بعض دوستوں

کے اوصاف بیان کرنے میں تو قصیدہ خواں ہو جاتے، ان کے ہم چشموں میں شاید ہی کسی کو انکی
تحریر سے کوئی تکلیف پہنچی ہو، ان کی طبیعت میں بڑی مٹھاس تھی، اس لیے نجی گفتگو میں بھی
ان کی زبان سے کبھی کوئی ایسی بات نہ نکلتی جس سے کسی کی دل آزاری ہو، بعض اوقات تو
اسی شفقت و محبت میں نوآموز اہل قلم کے لیے ایسے تعریفی کلمات لکھ جاتے جن کا وہ مستحق نہ
ہوتا، لیکن ان کی تعریف یا داد دل بڑھانے اور کام کا حوصلہ پیدا کرنے کی خاطر ہوتی، اور
ان کی اس مخلصانہ فراخدلی نے ان کے بہت سے شاگردوں کو اہل قلم اور مصنف بنا دیا،
اور ان کے احباب تو ان کے علم و فضل کے علاوہ ان کی سیر چشمی، رواداری، جوہر شناسی،
قدر دانی، مرنجاں مرنج طبیعت اور مزاج کی شگفتگی سے ہمیشہ ان کے گرویدہ رہے۔

(باقی)

منوچہری دامغانی

از جناب مولوی ضیاء احمد صاحب بدایونی ایم اے ریڈر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی

عرب فاتح جہاں گئے اپنا مذہب، تہذیب، زبان و ادب بھی ساتھ لیتے گئے، اور مفتوحین کی تہذیب و تمدن پر ایک ہمہ گیر اور دیرپا اثر چھوڑ گئے، عراق، شام، مصر اور دوسرے ممالک کی تاریخ ہمارے دعوے کی شاہد ہے، البتہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے، ایران ضرور ایک حد تک سخت جان نکلا لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایرانی زبان اور ایرانی ادب پر بھی عربی کا زبردست اثر ہے، الفاظ، تراکیب، انداز بیان، طرز تخیل، تلمیحات، اشارات، امثال، اصطلاحات، تشبیہات، استعارات، قواعد زبان، اصول اوزان، غرض کون شعبہ ہے جو عربی کا مرہون احسان نہیں، فارسی ادیبوں کی تصانیف میں ہر ہر قدم پر آیات و احادیث، اقوال و اشعار عرب کے حوالے ملیں گے، فارسی شعرا کے یہاں بھی کم و بیش یہی حال ہے، لیکن اس وصف میں منوچہری کی شخصیت سب سے ممتاز نظر آتی ہے، اس کے کلام میں عربی کی صدائے بازگشت اس قدر نمایاں ہے کہ جو شخص عربی ادب پر کافی دسترس نہ رکھتا ہو وہ اس کے اشعار سے پورے طور پر حظ نہیں اٹھا سکتا،

منوچہری غزنوی دور کا شاعر ہے، اور تمام تذکرہ نگاروں نے اس کی قصیدہ نگاری کو سراہا ہے، صحیح سال ولادت تو معلوم نہیں، البتہ یہ مسلم ہے کہ وہ چوتھی صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوا، لباب الالباب، تذکرۃ الشعرا دولت شاہ، مجمع الفصحاء، شعر العجم، تاریخ ادبیات

ایران شفق، اور براؤن وغیرہ تقریباً سب نے اس کی کنیت ابو النجم، نام احمد اور تخلص منوچہری بتایا ہے، لباب الالباب میں اس کے باپ کا نام قوص (؟) اور دادا کا نام احمد قلمبند کیا ہے، اسکے برخلاف صاحب مجمع الفصحا کے نزدیک اس کے باپ کا نام یعقوب تھا، اگرچہ اس نے اپنا ماخذ نہیں بتایا لیکن اس کا بیان قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، وہ شاہی خاندان سامانیہ سے تعلق رکھتا تھا، جیسا کہ خود کہتا ہے،

منم از نژاد بزرگان ساماں   کہ بودند شاہان چترو کواکب

اس کا لقب شصت گلہ تھا، جس کی توجیہ تذکرہ نگاروں نے یوں کی ہے کہ وہ سلاطین کی فیاضی سے نہایت دولتمند اور ساٹھ گلوں کا مالک تھا، لیکن ڈاکٹر شفق کا خیال ہے کہ یہ در اصل ایک دوسرے متاخر شاعر شمس الدین احمد بن منوچہر کا لقب تھا، ہمنامی کے التباس نے یہ لقب منوچہری کو بخش دیا، مجمع الفصحا کے مولف کی تحقیق یہ ہے کہ یہ شصت گلہ نہیں بلکہ شست گلہ ہے، یعنی ایسا شخص جس کا انگوٹھا چھوٹا اور موٹا ہو، یا اس میں کوئی قدرتی نقص ہو، اس معنی کی تصدیق لغت سے بھی ہوتی ہے، اس کا وطن دامغان تھا، جو خراسان کا ایک شہر ہے، اور طہران کے شمال مشرق میں واقع ہے، اکثر بڑے اور مشہور آدمیوں کی طرح اس کے ابتدائی حالات زندگی بالکل تاریکی میں ہیں، لیکن اتنا معلوم ہے کہ وہ شروع ہی سے غیر معمولی دل و دماغ اور حیرت انگیز ذہن و حافظہ لے کر آیا تھا، اور لڑکپن ہی میں بدیہہ گوئی کی آزمائشوں میں کامیاب رہ کر مشہور ہو گیا تھا، اس کے کلام کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ علوم متداولہ اور عربی ادب میں دستگاہ کامل رکھتا تھا، چنانچہ خود کہتا ہے،

من بدانم علم دین و علم نحو و علم طب

---

[1] تاریخ ادبیات ایران از شفق و راحۃ الصدور،

اس کو عام طور پر شعرائے[1] دربار محمود میں شمار کیا جاتا ہے، مگر جیسا کہ علامہ شبلی نے لکھا ہو اس کا دربار محمود سے تعلق درست نہیں، کیونکہ اس کی کلیات میں کوئی قصیدہ محمود کی مدح میں نہیں ملتا، در اصل وہ امیر منوچہر بن قابوس بن وشمگیر کے دربار سے متوسل تھا، اور اسی مناسبت سے اس نے منوچہری تخلص اختیار کیا تھا، منوچہر زیاری خاندان کا فرمانروا تھا، جس نے اکیس سال طبرستان میں حکومت کرکے ۴۲۴ھ میں وفات پائی، اس سے تین سال قبل محمود غزنوی کی وفات ہوئی اور اس کا فرزند محمد تخت پر بیٹھا، مگر وہ جلد ہی قید کرلیا گیا، اور اس کا بھائی مسعود وارث سلطنت ہوا، منوچہری کے اکثر قصائد اسی مسعود اور اسکے وزراء و امراء کی مدح میں ملتے ہیں، بعض قصائد منوچہر وغیرہ کی تعریف میں بھی محفوظ رہ گئے ہیں، اس بناپر کہنا چاہیے کہ وہ سلطان مسعود کے عہد میں دربار غزنی کا متوسل اور مقربین سلطان میں شامل ہوا، کہاجاتا ہے کہ وہ ملک الشعراء عنصری کا شاگرد تھا، لیکن یہ محض دربار میں رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ اور اس کی خوشنودی کا طریقہ تھا، ملاحظہ ہو قصیدہ شمع، ورنہ وہ عنصری سے شاعری میں برتر تھا، دولت شاہ اور تقی کاشانی کا بیان ہے کہ وہ ابو الفرج سجزی کا شاگرد تھا، مگر ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں دو وجہ سے تامل ہے، اول تو قدیم تذکرہ نگار اس تلمذ کا ذکر نہیں کرتے، دوسرے ابو الفرج سجزی کے کلام کا جو نمونہ دستیاب ہوا ہے وہ اسکو درجہ دوم کے شاعر سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا، اگر یہ بیان صحیح ہے تو اس کی خوش قسمتی میں کیا شک ہے کہ اس کو منوچہری سا شاگرد ملا، جو فخر استاد ثابت ہوا، دولت شاہ کے بیان کے بموجب[2] یہ ابو الفرج سجزی عنصری کا بھی استاد ہے، غالباً اسی سے لوگوں کو دھوکا ہوا، اور وہ سجزی کو

[1] جن اشعار سے عوفی کو دھوکا ہوا ہے وہ محمود کی نہیں بلکہ مسعود بن محمود کی مدح میں ہیں، دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی عوفی کی تقلید کی ہو، اغلب یہ ہو کہ وہ ۴۲۱ھ میں رے سے غزنی پہنچا ہے [2] دیکھو تذکرہ دولت شاہ

منوچہری کا استاد سمجھ بیٹھے، اس کے حالات اور کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت دولتمند تھا، اور لوگ اس پر حسد کرتے تھے، منوچہری سالک راہ طریقت اور امام الحرمین[1] کا شاگرد اور معتقد تھا اس نے عمر[2] زیادہ نہیں پائی، اور ۴۳۲ھ میں سفر آخرت کیا،

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، منوچہری کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت جس میں وہ سب سے منفرد ہے، عربی اسلوب ہے، قبل اس کے کہ اس کی تفصیل پیش کی جائے، عربی شاعری پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنا ضروری ہے،

عہد جاہلیت یعنی زمانۂ قبل از اسلام میں عربوں کی زندگی تمامتر بدویت کی زندگی تھی، نہ وہ کسی پر حاکم تھے نہ کسی کے محکوم، ہر قبیلے کا شیخ جدا تھا، اسی کو جا ہو حاکم سمجھ لو۔ وہ ایک بے آب و گیاہ ملک کے رہنے والے تھے، ان کی ملکیت میں اونٹوں کے گلے اور بکریوں کے ریوڑ کے سوا کیا تھا، جب تک کسی علاقے میں چارہ، پانی ملا، وہاں ٹھہرے، جب وہ ختم ہوگیا تو خیمے اکھاڑ کر دوسری جگہ جا بسے، اکثر ایسا ہوتا تھا کہ چارے اور پانی پر دوسرے قبیلے سے لڑائی چھڑ جاتی اور برسوں جاری رہتی، فاتح فریق مفتوح کی عورتوں کو اسیر کرلیتا اور مویشی کو ہانک کرلے جاتا،

یہی وجہ تھی کہ وہ لڑکیوں کی پیدائش کو اپنے حق میں ایک فال بد سمجھتے تھے، اسی بدوی زندگی میں کبھی ایسا ہوتا کہ کسی نوجوان کو اپنی بنت عم یا ہمسایہ قبیلے کی کسی دوشیزہ سے پاک محبت ہوجاتی، اور دونوں میں چھپ چھپ کر ملاقاتیں ہوتیں، ان حالات کے ساتھ قدرت نے ان کو بعض اعلیٰ اخلاق سے بھی بہرہ ور کیا تھا، یہ صحیح ہے کہ وہ تندخو، جنگجو، عیش پرست اور میخوار تھے، مگر اس کے ساتھ ہی شجاعت، سخاوت، حریت ضمیر اور وفائے عہد میں بھی ان کا جواب نہ تھا،

[1] امام الحرمین ابو المعالی عبد الملک بن محمد جوینی جنکا شمار امام غزالی کے اساتذہ میں ہے [2] لباب الالباب عوفی ۲

گرم مزاج، جوشیلی طبیعت، آزادانہ زندگی ان کی خصوصیات تھیں جن پر ان کو ناز تھا، زبان آوری میں وہ خود کو عرب (کھل کر بات کرنے والا) اور اپنے سوا سب کو عجم (گونگا) کہتے تھے، پھر خدا نے ان کو زبان ایسی عطا کی تھی، جس کا ذخیرۂ الفاظ بے پناہ، جس کی قوت اُن تھاہ اور جس کی صلاحیتیں غیر معمولی تھیں، یہی وجہ ہے کہ جس موضوع پر وہ کچھ کہتے وہ از دل می خیزد و بر دل می ریزد کا مصداق ہوتا، لڑائیوں کے رجز، کامیابی کے فخریہ ترانے، مقتولین جنگ کے مرثیے، حسن و عشق کے نغمے جس جوش اور زور کے ساتھ عربی شاعری میں ملتے ہیں، دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں بھی بمشکل ملیں گے، ان کے کلام میں مدح اور ہجو کے نمونے بھی موجود ہیں، مگر خوبی یہ ہے کہ مدح اکثر صلے سے بے نیاز، اور ہجو عموماً ابتذال سے پاک ہے، اسی کا نتیجہ تھا جب نابغہ اور اعشیٰ نے مدح کا صلہ قبول کیا تو وہ تمام قوم میں بدنام ہو گئے، ایک مرتبہ زہیر نے ہرم بن سنان کی مدح میں کچھ شعر کہے، کیونکہ اس نے اپنے اثر سے دو قبیلوں میں مصالحت کرا دی تھی، ہرم نے شاعر کو ایک گراں قدر رقم بھیجی، اس نے رقم تو لے لی، لیکن اس روز سے یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ جب کسی محفل میں جاتا اور وہاں ہرم بھی موجود ہوتا، تو ہرم کو چھوڑ کر باقی حاضرین کو سلام کرتا اور کہتا، "انعموا صباحاً غیر ھرم بن سنان - وخیرکم استثنیت"

اسی طرح ایک بار کسی اموی خلیفہ نے ایک شاعر سے اپنی مدح کی فرمایش کی، اس نے چھوٹتے ہی جواب دیا " اِفعَل حتیٰ اَقُولَ -" کچھ کر کے دکھاؤ تو میں کہوں،

غرض ان کی شاعری زندگی کی ترجمان، تصنع سے پاک اور صداقت کی تصویر ہوتی تھی،

وان اشعر بیت انت قائلہ شعر یقال اذا انشدتہ صدقا

یہی وجہ تھی کہ شاعری کو عرب سوسائٹی میں خاص وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اور جب کسی قبیلے میں کوئی شاعر نامور ہوتا تو دوسرے قبائل آ آ کر اس کو مبارکباد دیتے، عربی

شاعری کا عموماً اسلوب یہ تھا کہ شاعر دوران سفر میں اپنے رفیقان راہ کی طرف مخاطب ہو کر کہتا ہے، ٹھہرو، ذرا سامنے والے کھنڈر پر رو لیں، یہ وہ جگہ ہے جہاں ایک زمانے میں محبوبہ کا قبیلہ ٹھہرا تھا، یہ ان لوگوں کے خیموں کا مقام ہے، یہاں ان کے اونٹ باندھے جاتے تھے، اس جگہ ان کے چولھوں کا نشان ہے، کیا زمانے تھے، جب چھپ چھپ کر محبوبہ سے ملاقاتیں اور راز و نیاز کی باتیں ہوا کرتی تھیں، اسی ضمن میں ایام وصال کی یاد، عہد فراق کے مصائب کی داستان، کوہ و بیابان کی سختیاں، اپنے کارناموں اور اپنے قبیلے کے مفاخر کا ذکر، اپنے اونٹ یا گھوڑے کی رفاقت کا بیان سب کچھ آجاتا تھا، یہ سیدھے سادے سچے واقعات اب بھی طبیعت پر اثر کیے بغیر نہیں رہتے، یہاں نمونے کے طور پر ہم امرء القیس کے مشہور معلقہ کے چند اشعار کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، آغاز یہ ہے:

قفا نبك من ذكرى حبيب ومنزل بسقط اللوى بين الدخول فحومل

رفیقو ٹھہرو ذرا ہم دوست اور اس کے فرودگاہ کی یاد میں جو سقط اللوی میں واقع ہے، رو لیں

پھر کہتا ہے کہ اگرچہ باد جنوب و شمال چلتی رہتی ہے، مگر دیکھو اس کے قیام گاہ کے نشان اب تک باقی ہیں، آہ وہ دن نہیں بھول سکتا جب محبوبہ جدا ہو رہی تھی، ادھر میری آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی جاری تھی، ادھر احباب تسلی دے رہے تھے۔ اس کے بعد شاعر حسینوں سے ملنے اور ان کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کا بیان بہت مزے لے لیکر کرتا ہے، اور عشق کا جلاپا، محبوبہ کا سراپا، اپنی بیقراری، اس کی دلداری، اپنی دلیری و پامردی، گھوڑے کی بیاباں نوردی، ریگزار و کہسار کے مراحل، سفر و حضر کے منازل، عجب نادر اور پر اثر انداز میں دکھاتا ہے، نیچرل تشبیہات اور لطیف اشارات کی بدولت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیال کے پردہ سیمیں پر ڈیڑھ ہزار برس پہلے کی چلتی پھرتی تصویریں جلوہ گر ہیں،

تمہید طویل ہوگئی لیکن ان اصحاب کی خاطر جو عربی سے متعارف نہیں ہیں، ایسا کرنا ناگزیر تھا، غرض منوچہری کے قصیدوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ عربی اشارات و تلمیحات بکثرت ہیں، بظاہر تو یہ ایک طرح کی روایت پرستی اور نقالی معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص ایران کے خیابانوں اور مرغزاروں میں رہتا ہوا عرب کے ریگستانوں اور ٹیلوں کی تصویر کشی کرے، لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ کوئی رنگ (شروع میں کتنا ہی سطحی اور مصنوعی سہی) مرور ایام سے کسی شخص کے دل و دماغ پر اتنا چھا جائے کہ پھر وہ اس سے باہر نکلنے اور سوچنے پر قادر نہ ہو، اس صورت میں وہ مصنوعی لبادہ جو بطور تفنن استعمال کیا تھا، آخر اصلی پیرہن کی طرح جسم پر چست ہو جاتا ہے، دور کیوں جاؤ، ریاض خیرآبادی کے دیکھنے والے ابھی بکثرت ہیں، مرحوم نے عمر بھر کبھی دخت رز کو منہ نہیں لگایا، اس کے باوجود ان کی شاعری میں تین چوتھائی کے بقدر خمریات ملتی ہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی شاعری جوش و اثر میں کسی سے کم ہے، بات یہ ہے کہ انھوں نے شروع میں غالباً تمثیل (Allegory) یا رمز (symbol) کے طور پر عشق کی سرمستی کو شراب سے تعبیر کیا، رفتہ رفتہ یہی کیفیت ان کے لیے حقیقت، اور قال ان کے حق میں حال بن گیا، ایک خالی الذہن شخص ان کا کلام پڑھ کر لامحالہ یہ سمجھے گا کہ ریاض کی تمام عمر میخانے ہی میں گذری ہوگی۔

آمدم بر سر مطلب، منوچہری کا کلام بیشتر قصائد اور مسمطات پر مشتمل ہے[1]۔ ان ہی دونوں کو اس کے شاہکار سمجھنا چاہیے، یوں تو اس کے یہاں غزلیات، قطعات اور رباعیات بھی ملتی ہیں، مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے، موضوع کے لحاظ سے اس کا کلام مدحیات یا خمریات سے باہر نہیں جاتا، لیکن تمام اصناف پر عربی ادب کی چھاپ لگی ہوئی ہے، ذیل

[1] منوچہری نے بکثرت مسمط لکھے ہیں اور خوب لکھے ہیں بعض کا خیال ہے کہ وہ پہلا مسمط گو شاعر ہے۔

کی مثالوں سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہو سکتی ہے، اس کا ایک قصیدہ ہے، "وقت بہار آمد و وقت ورد موردّ" اس میں غیر مانوس عربی قوافی کی بھرمار ملاحظہ ہو، مجنّد، عسجد، معبد (ایک مطرب کا نام) مصعّد، مسہّد، مطرّد، امرد، مبلّد، ارعد، موقّد، مبرّد، مسدّد، مزرّد، مبرود، یقرد، فدفد وغیرہ، اسی طرح دَسَن، فطن، ذویزن، متکن، مجن، شطن، عکن، لاتعجلن، عطن، یا باطیہ، اودیہ، اندیہ، تہدیہ، اخبیہ، ادعیہ، خابیہ، الویہ، مادیہ، اضحیہ، یامے (میہ ایک معشوقہ کا نام)، حے، یبوے، اُبَے، بُنے، قُصَے وغیرہ وغیرہ، وہ عربی تراکیب بلکہ مصرع کے مصرعے اس بے تکلفی و صفائی کے ساتھ لاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، چند شعر سنیے:

سلامٌ علیٰ دار ام الکواعب — بتان سیہ چشم عنبر ذوائب
رسوم الطلل والدیار الدوارس — چو بر صدر منشور توقیع صاحب
سمن راز گشتہ دیار سلاحف — چمن زار گشتہ دجار ثعالب

. . . .

زخیمہ بروں آمدہ خوبرویاں — گرازاں چو طاوس گرد مشارب
لب لعل ضاحک خم جعد کافر — رخ خوب لامع سر زلف لاعب
معنبر ذوائب معقد عقائص — مسلسل غدائر سجنجل ترائب
خراماں بت من میان جواری — چو حور بہشتی میان کواعب

. . . .

نگشدم رحال وزمام نجیبم — واُلہمت بالنحر والنحر واجب
چو مرکب فدائے بت دلستاں شد — مرا گفت دلبر کہ طال المعاتب
شدم از صحاری من اندر عماری — وقد صرتُ حقاً سعید العواقب

آپ نے دیکھا کہ نہ صرف تراکیب و عبارات عربی ہیں، بلکہ انداز تخئیل و پیرایۂ بیان بھی وہی ہے۔ وہی امرؤالقیس کی طرح معشوقہ اور اس کی سہیلیوں سے چھیڑ چھاڑ، وہی ان کی مہمانی کیلیے اپنا اونٹ ذبح کرنا، اور پیادہ ہونے پر معشوقہ کی عماری میں جگہ پانا، وہی بھیڑ اور ریگستان میں اونٹوں پر سفر، وہی تاریک اور طوفانی رات میں راہ کے مصائب۔

ایک جگہ عربی شعرا کے نام گناتا ہے، مثلاً

کو جریر و کو فرزدق کو زہیر و کو لبید　　روبۂ عجاج و دیک الجن و سیف ذویزن

دوسرے قصیدے میں کہتا ہے

امرؤالقیس و لبید و اخطل و اعشائے قیس　　بر طلل ہا نوحہ کردندے و بر رسم تلے

آن کہ گفت است اذ نتنا و آنکہ گفت اذ تنتی[۱]　　آنکہ گفت السیف اصدق آنکہ گفت البلی الہوی

ایک مقام پر اپنے فخر اور اپنے حریف پر طعن کے طور پر لکھتا ہے:

من بسے دیوان شعر تازیان دارم زبر　　تو ندانی خواند الا ہبی بصحنک فاصبحین[۲]

اس نے متعدد قصیدے شعرائے عرب کے جواب میں ان ہی کی زمینوں میں لکھے ہیں، اور اس کا فخر کے طور پر اظہار بھی کر دیا ہے، چنانچہ ایک نظم میں جو عبداللہ بن المعتز کی (ونحن بنو العم اولی بہا) زمین میں لکھی ہے، کہتا ہے:

بہ زیر و بم شعر اعشائے قیس[۳]　　زننده ہمی زد بہ عنا بہا

[۱] پہلا ٹکڑا حارث بن حلزہ یشکری کے قصیدے کا ہے، دوسرا کُثیّر کے قطعہ کا، تیسرا ابو تمام کے اور چوتھا متنبی کے قصیدے کا ہے، اور متنبی کی بجائے شعرالعجم میں الاہبی، اور فرانس کے مطبوعہ دیوان منوچہری میں الذانتین ہے، لیکن دونوں غلط ہیں [۲] یہ عمرو بن کلثوم تغلبی کے قصیدے کا ابتدائی ٹکڑا ہے [۳] یہ بحر اعشیٰ قیس سے منسوب ہو کر ایران میں راہ اعشیٰ (اعشیٰ کی دھن) ہی کے نام سے مشہور ہے۔

وکاسٍ شربتُ علی لذۃٍ　　واخریٰ تداویتُ منہا بہا

لکے یعلم الناس انی امرؤ　　اخذت المعیشۃ من بابہا

علیٰ ہذا: بہ آں وزن این شعر گفتم کہ گفت است　　ابو شیص اعرابیؑ باستانی

اشاقک[۱] واللیل ملقی الجران　　غراب ینوح علی غصن بان

عربی ادب اور عربی تاریخ کے حوالے جس قدر منوچہری کے یہاں ملتے ہیں، کسی فارسی شاعر کے کلام میں نہیں پائے جاتے، اعشیٰ کا سودہ بن علی یمانی (صحیح ہوذہ بن علی یمامی ہے) سے، ابونواس بن ہانی کا خصیب مالک سے، علی بن ابراہیم کا ہارون رشید سے شاعری کے گراں قدر صلے حاصل کرنا اس کے اشعار میں آیا ہے، جس کے لیے عربی ادب و محاضرات سے آگاہ ہونا ضروری ہے، اسی طرح معبد[۲]، صاحب بن عباد، مبرد، ابو معاذ، بشار، ابن مقبل، ابن رومی، اصمعی، ابن جنی، جمیل، بثینہ، عزہ، جریر، ام اوفی، سیبویہ، جحیٰ، اصحاب اشعری، اور دوسری تلمیحات کا حال ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عربیت فردوسی کی ایرانیت کا رد عمل تھی۔

علوم کی اصطلاحات بھی اس نے اکثر برتی ہیں، مثلاً:

منجم ببام آمد از نور مے　　گرفت ارتفاع سطرلابہا

زده چتر ناہید اندر مشارق　　گرفتہ زحل راه سوے مغارب

ثریا چو در تاج مرجان عمانی　　زبانا چو در دیر قندیل راہب

ہم بداں رہ کاشتقاق فعل از فاعل بود　　سعد چرخ از کنیت و نام تو گیرد اشتقاق

[۱] عام نسخوں میں سا نتاک ہے، مگر صحیح اشاقک ہے [۲] ان تلمیحات کے لیے عربی ادب و تاریخ کی طرف مراجعت کی جائے۔

باشرح ابن جنی و بانحو سیبوے   بانظم ابن رومی و بانثر اصمعی

باحفظ ابن معتز و باصحبت آئے   باخط ابن مقلہ و باحکمت زہیر

شدہ نسر واقع چنان شاخ نخلے   شدہ نسر طائر بسان سہ بیضہ

آخری شعر جس قصیدے کا ہے اس میں برابر کئی شعروں میں نجوم کی اصطلاحات بے تکلف استعمال کرتا چلا گیا ہے،

اس وصف کے علاوہ منوچہری کی دوسری خصوصیات پر بھی نظر ڈالتے چلیے، اس میں شک نہیں کہ وہ ایک فطری شاعر (Born poet) تھا، اور جو خصوصیات ایسے شاعر کے لیے درکار ہیں وہ اس میں بدرجۂ کمال موجود تھیں، سب جانتے ہیں کہ شاعری کی عمارت دو بنیادوں پر قائم ہے، تخئیل اور محاکات، اگرچہ شعر میں بڑی حد تک تخئیل کی کارفرمائی ہوتی ہے، تاہم محاکات کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا،

منوچہری کے کلام میں تشبیہات کی ندرت اور فراوانی کو تخئیل کا، اور منظر نگاری، واقعہ نگاری اور سراپا نگاری کو محاکات کا کرشمہ سمجھنا چاہیے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں خصوصیات پر جدا جدا بحث کی جائے،

تشبیہات۔ اس کی تشبیہات عموماً نیچرل، نادر، مرکب اور متحرک ہیں، اور یہی اوصاف ہیں جن کو دیکھ کر اس کی قوت تخئیل پر ایمان لانا پڑتا ہے، اس عہد تک تخئیل میں وہ نزاکت اور پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی تھی جو بعد کو خاقانی اور نظامی کی شاعری کا طرۂ امتیاز بنی، پھر بھی منوچہری کے یہاں تخئیل میں بڑی دلکشی پائی جاتی ہے، مثلاً

جہندہ بلبل و صلصل چو بازیگر بہ چنبرہا   چو چنبرہاے یاقوتیں برو ز باد گلبن ہا

[1] شعرالعجم

یعنی بہار میں گلاب کے درخت ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے یاقوت رنگ کی رسی کے حلقے ہیں اور بلبلیں اور قمریاں جوان پر پھدکتی پھرتی ہیں گویا بازیگر رسی پر کرتب دکھا رہے ہیں،

نہادہ بر طبق ہا بر ز زر ساو ساغرہا   چو حور انند نرگس ہا ہمہ سیمیں طبق بر سر

نرگس (عبہر) سفید پھول ہوتا ہے جس کا درمیانی حصہ زرد ہوتا ہے، شاعر کہتا ہے، نرگس کے پھول گویا حوریں ہیں، جو سر پر چاندی کے تھال لیے ہوئے ہیں، اور ان تھالوں میں خالص سونے کے پیالے رکھے ہوئے ہیں،

نامہ گہ باز کند گہ شکند بر شکنا   پوپو یک پیکے نامہ زدہ اندر سر خویش

یعنی ہدہد ایک قاصد ہے جس نے اپنے سر میں خط گھرس لیا ہے، کبھی خط کھولتا ہے اور کبھی تو کر کے لپیٹ لیتا ہے،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تشبیہات کا اس کے دماغ میں بڑا ذخیرہ ہے جس کو بے دریغ لٹاتا ہے، پھر زبان کی روانی اور الفاظ پر قدرت کا یہ حال ہے گویا دریا موجیں مار رہا ہے، ایک قصیدہ میں باغ کے پھلوں کا ذکر کرتے ہوئے تشبیہات کا انبار لگا دیا ہے، فارسی شعرا پر عموماً الزام ہے کہ ان کے یہاں باغ و بہار کے بیان میں نازک خیالی اور بلند پروازی کی تو کمی نہیں، مگر سیکڑوں اشعار پڑھ جائیے خیالی طوطا مینا کے سوا کچھ نہیں، حقیقی بہار اور باغ کا نقشہ کوسوں نظر نہیں آتا، لیکن منوچہری کی شاعری اس عیب سے بری ہے، لکھتا ہے:

در کیسہ یکے بیضۂ کافور کلان است   آبی چو یکے کیسہ گکے از خز زرد است

دہ نافہ و دہ نافگک مشک نہان است   و اندر دل آں بیضۂ کافور رباحی

یعنی امرود گویا زرد ریشم کی ایک تھیلی ہے جس میں کافور کا بڑا سا انڈا رکھا ہوا ہے، اور اس انڈے کے اندر مشک کے چھوٹے بڑے نافے چھپے ہوئے ہیں،

وآں سیب بچہ دار یکے مردم بیمار — کز جملۂ اعضاے تن او را دو رخان است

یک نیمہ رخش زرد و دگر نیمہ رخش سرخ — ایں را ہیجان دم وآں را یرقان است

"یعنی سیب نہیں، بلکہ ایک بیمار ہے جس کے تمام اعضا میں صرف دو رخسارے نظر آتے ہیں، ان میں بھی ایک رخسارہ سرخ، دوسرا زرد، گویا ایک کو دوران خون کا مرض ہے، دوسرے کو یرقان کا" اسی طرح پانچ اشعار میں انار کا وصف، اور انیس اشعار میں انگور کی تمثیل چلی گئی ہے، جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، ہم یہاں طوالت کے خوف سے صرف ترجمے پر اکتفا کریں گے، کہتا ہے

"انار ایک حاملہ عورت سے مشابہ ہے، جس کے شکم میں متعدد بچے ہیں، جب تک اس کو زمین پر نہ دے مارو بچہ پیدا نہیں ہوتا، جہاں پیدا ہوا لوگ اس کو کھا جاتے ہیں، عورت کے زیادہ سے زیادہ دو یا تین بچے پیدا ہوتے ہیں، مگر اس کے پیٹ میں بیک وقت تین تین سو بچے پائے جاتے ہیں، سب جانتے ہیں کہ جب تک بچہ کی ولادت نہیں ہوتی ماں اس کے لیے بستر نہیں لگاتی، لیکن انار کے پیٹ میں بچوں کے لیے زرد بستر لگا ہے، اور اس پر بچے کے سر کا نشان ہے"، اب انگور سیاہ کی تعریف سنیے "اس کو ایک غالیہ رنگ عورت سمجھو جس کا شکم گویا غالیہ دان ہے، (غالیہ ایک سیاہ خوشبو کا نام ہے) اس کے شکم میں ایک جان (عرق) اور تین دل (بیج) ہیں، اور لطف یہ ہے کہ یہ دل ہڈی سے بنے ہیں. لوگ کہتے ہیں کہ جاندار کے لیے جان اور دل کی ضرورت ہے، لیکن اس میں دل کی جگہ ہڈیاں اور جان ہے، جان یا روح کا کوئی رنگ نہیں ہوتا، مگر انگور کی روح لالے کی طرح سرخ رنگ ہے، پھر روح خوشبو سے معرا ہوتی ہے، اس میں مشک و عنبر کی سی خوشبو ہے، اگر انگور چاند کی طرح حسین اور سیاہ رنگ ہے تو تعجب کی کیا بات ہے، کیا حسین سانولے نہیں ہوتے، (چاند کے سیاہ داغوں ہی کو کیوں نہ دیکھ لو) اس میں اگر کوئی عیب ہے تو یہ کہ یہ دختر رز جوان ہونے کے باوجود کنوارپن میں حاملہ ہوگئی ہو،

اس[1] کا شوہر کے بغیر حاملہ ہونا مریمؑ بنت عمران کے واقعے سے ملتا جلتا ہے، بلکہ اس سے زیادہ پر لطف ہے، حضرت مریمؑ کے دہن میں روح پھونکی گئی تھی، مگر اس کے نہ دہن ہے، نہ لب، ان کے شکم سے فرزند پیدا ہوا، اس کے بطن سے زندگی جنم لیتی ہے، جیسے وہ روح اللہ تمام مخلوق کے سردار تھے، یہ راح (شراب) بھی تمام دنیا پر حکمرانی کرتی ہے، اُن کو لوگوں نے پکڑ کر کھینچا اور قتل کر دیا تھا، اس کو بھی لوگ کھینچتے اور قتل کرتے ہیں، انھوں نے ایک دو مردوں کو معجزہ کے طور پر زندہ کیا تھا، یہ تمام دنیا کو زندگی دیتی ہے، ان کے ہاتھ میں زندگی اور موت تھی، تو اس کے قبضے میں بھی ہے، ان کے قتل کے درپے یہودی ہوگئے تھے، اس کو مسلمان بھی قتل کرنے سے نہیں چوکتے، لیکن جیسے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، اس کو بھی نقصان نہیں پہنچ سکتا، جیسے ان کو رنج کے بعد راحت میسر ہوئی، اس کا بھی یہی حال ہے، ان کو آسمان پر جگہ ملی، اس کو امیر و وزیر ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں"،

ہم نے دل پر جبر کر کے یہ ترجمہ نقل کیا ہے، دکھانا یہ تھا کہ منوچہری کے یہاں تخئیل کی زرخیزی اور اسالیب ادا کی فراوانی حیرت انگیز ہے، شعر پر شعر لکھتا چلا جاتا ہے، اور زور بیان میں فرق نہیں آتا، اگر وہ اپنی قوت ان لغویات اور مدحیات میں ضائع کرنے کے بجائے کسی صحیح مصرف میں استعمال کرتا تو فردوسی سے سبقت لے جاتا،

تشبیہات کی مثالیں اس کے یہاں بکثرت ہیں، خصوصاً دخت رز کے حاملہ ہونے اور وضع حمل کرنے کی داستان بار بار نئے نئے پیرایوں میں سناتا ہے، شاید خاقانی کی طرح اس کو یہ تشبیہ ضرورت سے زیادہ مرغوب تھی، مگر طوالت کے خوف سے ان ہی مثالوں پر اقتصار کرنا مناسب ہے،

محاکات ـ منوچہری کے کلام میں واقعات کا تسلسل، جزئیات کی تفصیل اور بیان کی قدرت

---

[1] منوچہری نے نہایت بیباکی سے شراب اور حضرت عیسیٰؑ میں موازنہ کیا ہے، ہم ان اشعار کو نقل کفر کفر نباشد کے طور پر درج کرتے ہیں،

کا یہ عالم ہے کہ جس منظر، شخص، یا واقعے کا ذکر کرتا ہے، سچ مچ تصویر کھینچ دیتا ہے، اور قارئین کو ناظرین کی صف میں لا بٹھاتا ہے،

ایک قصیدے میں اپنے سفر کا حال، رات کی طوفانی کیفیت، حسینوں سے ملاقات، محبوبہ سے راز و نیاز، اس کے اور اس کی سہیلیوں کے لیے اونٹ ذبح کرنا، اور پھر محبوبہ کی عماری میں سوار ہو کر منزل مقصود تک پہنچنا بیان کیا ہے، اور آنکھوں کے سامنے پورا نقشہ کھینچ دیا ہے،

شب تیرہ و باد غضبان ندفد   ہمی آمد آواز غول از جوانب
چو آواز رعد از سحاب بہاری   فتادہ برہ بر غطیط نجائب
ہمہ راہ و بے راہ خار مغیلان   عقابان وادی بسانِ عقارب
فتاد آنگہے چشم من بر قوافل   عیون غرقہ در خونِ الدمع ساکب
ز دہ خیمہا دیدم اندر مجاری   درخشاں چو در دیر مصباح ثاقب
ز خیمہ بروں آمدہ خوبرویاں   گرازاں چو طاؤس گردِ مشارب
معنبر ذوائب معقد عقائص   مسلسل غدائر مجنجل ترائب
ہمہ بر ملک سیاہی ہمہ رخ الٰہی   ہمہ بر بدائع ہمہ تن عجائب
خراماں بت من میان جواری   چو حور بہشتی میانِ کواعب
ز ارواح صافی تر اندر لطائف   ز خورشید روشن تر اندر کواکب
مرا گفت مہمان ناخواندہ خواہی   قمر چہر گانے مقوّس حواجب
اگر زانکہ داری سر میز بانی   زما بہ نہ بینی انیس و مصاحب
فگندم ز حال و ز نام نجیبم   والہمت بالنحر والنحر واجب
چو مرکب فدائے بتِ دلستاں شد   مرا گفت دلبر کہ طال المعاتب

شدم از صحاری من اندر عماری   وقد صرت حقاً سعید العواقب

ان اشعار کو پڑھ کر اس کی منظر نگاری، واقعہ کی تصویر کشی، اور سراپا کی عکاسی کا کلمہ پڑھنا پڑتا ہے، درحقیقت جس عمارت کو صدیوں کے بعد قاآنی نے بلند کیا، اس کی بنیاد مدتوں پہلے شعرائے غزنویہ خصوصاً منوچہری نے ڈال دی تھی، یہ درست ہے کہ وہ دوسرے شعرا کی طرح مدح میں مبالغہ اور خوشامد سے بہت کام لیتا ہے، لیکن اوپر کی خصوصیات نے ایک حد تک ان سب کی تلافی کر دی ہے،

اجازت دیجیے کہ اس کے ایک دوسرے مشہور قصیدے کے چند شعر اور بطور نمونہ پیش کر دوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عرب بدو اپنے رفیق اونٹ پر اپنے خیمے سے رخصت ہو رہا ہے، اس کی معشوقہ رو رو کر جل تھل بھر دیتی ہے اور وہ اس سمجھا بجھا کر کوہ و بیابان کی سختیاں سہنے کے لیے چل کھڑا ہوتا ہے،

الا یا خیمگی خیمہ فرو ہل   کہ پیش آہنگ بیروں شد ز منزل
تبیرہ زن بزد طبل نخستیں   شتر باناں ہمی بندند محمل
نماز شام نزدیک است و امشب   مہ و خورشید را بینم مقابل

. . . .

نگار من چو حال من چنیں دید   ببارید از مژہ باران وابل
تو گفتی پلپلِ سودہ بکف داشت   پراگند از کف اندر دیدہ پلپل
بیامد او فتاں خیزاں برِ من   چناں مرغے کہ باشد نیم بسمل
دو ساعد را حمائل کرد بر من   فرو آویخت از من چوں حمائل

. . . .

چو برگشت از من آں معشوق ممشوق — نہادم صابری را سنگ بر دل

اس کے بعد سفر کے مراحل و مصائب کی تفصیل ہے

اب ترتیب کے لحاظ سے (کہ اہمیت کے لحاظ سے) آخر میں ہمیں چند باتیں اس کی زبان کے بارے میں کہنا ہیں، سچ پوچھیے تو شعر و ادب میں اصل کھیل زبان و بیان کا ہے، کیونکہ ایک شاعر یا ادیب پہلے فن کار ہے اور پھر مفکر، خیالات تو دوسروں کے یہاں بھی ہوا کرتے ہیں، شاعر یا ادیب جب ان کو اپنے زبان کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا ہے تو سننے والے سر دھننے لگتے ہیں، اسی کے متعلق کہا گیا ہے

واذا قیل اطمع الناس طرا — واذا رم اعجز المعجزینا

یہی چیز ہے جس کی طرف style is The man کے مقولے میں اشارہ کیا گیا ہے، اور یہی وصف ہے جو کسی اہل قلم کو صاحب طرز بناتا ہے،

منوچہری کے اشعار میں صفائی اور روانی کا یہ عالم ہے کہ گویا دریا لہریں لے رہا ہے، الفاظ پر ایسی قدرت اور بندشوں میں اس قدر چستی کم شعرا کے حصے میں آئی ہوگی بحروں کا ترنم اور موسیقیت بے ساختہ دل کو کھینچتی ہے، قصد تھا کہ اس کے کلام سے اس وصف کی مثالیں پیش کی جائیں، مگر پھر یاد آیا کہ اب تک جو اشعار مختلف خصوصیات کے تحت نقل ہوئے کیا وہ تمثیل کے لیے کافی نہیں، تاہم اگر اس پر اصرار ہو تو چند اشعار اور سہی،

جہانا چہ بے مہر و بد خو جہانی — چو آشفتہ بازار بازارگانی

بدرد کسان صابری اندر و تو — بہ بدنامی خویش ہمداستانی

بہر کار کردم ترا آزمایش — سراسر فریبی سراسر زیانی

وگر آزمایمت صد بار دیگر — ہمانی ہمانی ہمانی ہمانی

عمی ترکس آنکش غنی ترکنی تو

فروتر کس آنکش تو برتر نشانی

بے شبہہ اس کلام میں صنائع و بدائع کا استعمال بھی ہے، اور غیر مانوس الفاظ بھی ملتے ہیں، جو امتداد زمانہ سے متروک ہو چکے ہیں، مگر ان سب باتوں کے باوجود اشعار کی روانی اور سلاست میں ذرا فرق نہیں آتا،

ابن المقفع کیجانب منسوب ارسطاطالیسی تراجم

از جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب ایم اے لیکچرار عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی

[مندرجۂ ذیل مقالہ اصل میں استاذ پول کراوس نے جرمن زبان میں لکھا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبد الرحمٰن بدوی نے اس کو مع چند دیگر مقالات کے عربی زبان میں ترجمہ کرکے "التراث الیونانی فی الحضارۃ الاسلامیۃ" کے نام سے شائع کیا، اب اسی مقالے کا اردو ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے، ڈاکٹر بدوی نے اس مقالے پر حسب ذیل نوٹ لکھا ہے،

"یہ علمی بحث اس مقالے پر تبصرہ ہے، جو استاد فرنشسکو جبر یٖلی نے "مؤلفات ابن المقفع" کے عنوان سے لکھا تھا، اور ۱۹۳۲ء میں "مجلۃ الدراسات الشرقیۃ" کی تیرہویں جلد میں صفحہ ۱۹۷-۲۴۷ میں شائع ہوا تھا، اور یہ تبصرہ بھی ۱۹۳۳ء میں اسی رسالے کی چودھویں جلد میں "ابن المقفع کے متعلق" کے عنوان سے صفحہ ۱-۱۲ میں ہوا تھا۔ اس کے دو حصے تھے، ایک ارسطا تراجم کے متعلق تھا، ذیل کا مضمون اسی کا ترجمہ ہے، دوسرا حصہ باب برزویہ کے بارے میں تھا۔"]

جبر یٖلی نے ابن المقفع کے متعلق جو مبسوط مقالہ لکھا ہے اس میں اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ یہ روایت کہ ابن المقفع نے فارسی ادب کے دوسرے تراجم مثلاً کلیلہ و دمنہ اور خدائی نامہ وغیرہ کی طرح ارسطو کی مؤلفات کے کسی جزو کا بھی ترجمہ کیا ہے، کیا کسی صحیح بنیاد پر قائم ہے؟ اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ ابن المقفع کی تمام علمی کاوشیں ادبی حیثیت رکھتی ہیں، مؤلف (جبر یٖلی) کی رائے میں اس کا احتمال نہیں ہے کہ یہ نسبت صحیح ہو، لیکن انھوں نے اس خیا

کی تائید میں کوئی دلیل نہیں دی اور نہ ان اہم ملحوظات کی توجیہ کی ہے، جو اس بارہ میں مسلمان مصنفین کے یہاں پائے جاتے ہیں، جبر یٖلی کے ملاحظات درج ذیل ہیں،

"اس لیے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ابن المقفع سریانی زبان جانتا تھا جس میں عموماً یونا فلسفہ کے مختصرات اور تراجم لکھے جاتے تھے، رہا ان کتابوں کے پہلوی ترجموں کا وجود، جیسا کہ اس سے قبل نفیرش نے گمان کیا تھا، اور جس کی طرف عربی اور ایرانی تراجم نے بھی ہلکے اشارے کیے ہیں، تو یہ ایسا مفروضہ ہے جس کی کافی شواہد سے تائید نہیں ہوتی۔"

جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ جس سبب سے ارسطاطالیسی تراجم ابن المقفع کی جانب منسوب ہوگئے ہیں، وہ دراصل ایک غلطی ہے، جس میں پچھلے اسلامی مورخین مبتلا ہوگئے ہیں،

سب سے پہلا ماخذ جو ابن المقفع کے ان تراجم کی طرف اشارہ کرتا ہے، وہ صاعد اندلسی کی "طبقات الامم" ہے، چنانچہ اس کا مصنف لکھتا ہے کہ

"رہی منطق تو پہلا شخص جو اس حکومت (دولت عباسیہ) میں اس کام کے لیے مشہور ہوا، وہ عبد اللہ بن المقفع ایرانی خطیب ہے، جو ابوجعفر منصور کا کاتب تھا، اسی ارسطو کی تینوں منطقی کتابوں کا جو منطق صوری میں ہیں ترجمہ کیا، ان کے نام کتاب قاطیغوریا، کتاب باری ارمیناس اور کتاب انولوطیقا ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس کے زمانے تک پہلی کتاب کے سوا ارسطو کی کسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا تھا، اسی طرح اس نے کتاب المنطق کے مقدمہ کا ترجمہ کیا جو فرفوریوس الصوری کی ایساغوجی کے نام سے مشہور ہے، یہ ترجمہ سلیس اور ماخذ سے قریب عبارت میں ہے، ایک ہندی کتاب کا بھی جو "کلیلہ و دمنہ" کے نام سے مشہور ہے ترجمہ کیا، یہ پہلی کتاب ہے، جو فارسی زبان سے عربی میں ترجمہ ہوئی، ابن المقفع عمدہ کتابوں کا مصنف بھی ہے، جن میں رسالہ "فی الادب" اور "السیاسۃ" مشہور ہیں، اس کا ایک رسالہ "الیتیمۃ" بھی

اس کا موضوع سلطان وقت کی اطاعت و فرمانبرداری ہے"۔

متاخرین نے اس باب میں اس سے زیادہ نہیں کیا کہ طبقات الامم کی اس عبارت کو جوں کا توں نقل کر دیا، مثلاً ابن القفطی نے تاریخ الحکما، میں "عبداللہ بن المقفع" کے نام کے تحت تقریباً حرف بحرف نقل کیا ہے، اسی طرح ابن ابی اصیبعہ نے عیون الانباء (مطبوعہ ا، ملر، قاہرہ ۱۸۸۲ء) کی جلد اول صفحہ ۳۰۸ پر "برزدیہ" نام کے تحت یہی کیا ہے،

اب سوال یہ ہے کہ صاعد نے یہ روایت کہاں سے لی، ابن ندیم کی الفہرست میں ابن المقفع کے بارے میں ایک طویل فصل ہے جس میں مؤلف نے اس کے حالات و تالیفات کو بیان کیا ہے لیکن اس کی فلسفیانہ تصانیف کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں ہے (ص ۱۱۸ مطبوعہ فلوگل) حالانکہ اس کا ذکر ہے کہ فارسی زبان سے ترجمہ کرنے والوں میں ایک ابن المقفع بھی تھا، اور مترجمین میں سرفہرست اسی کا نام رکھا ہے،

البتہ الفہرست میں ایک دوسرے مقام پر اس قسم کے بیانات ملتے ہیں، جو پہلی نظر میں صاعد کے قول کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں، مثلاً صفحہ ۲۴۸ و صفحہ ۲۴۹ میں ابن المقفع کا شمار ان لوگوں میں کیا گیا ہے، جنھوں نے قاطیغوریاس اور باری ارمنیاس کو مختصر کیا تھا، اس کی تائید جاحظ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو اس نے کتاب الحیوان (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۳ھ) کی جلد اول صفحہ ۳۰ پر لکھا ہے، جاحظ المتوفی ۲۵۵ھ اس واقعہ سے بہت ہی قریب زمانہ میں تھا، اس لیے وہ متاخرین ترجمہ کرنے والوں میں سے اکثروں سے ذاتی طور پر واقف رہا ہوگا، وہ ترجمہ کے مسئلہ کی تنقید اور یونانی زبان سے جو تراجم ہوئے ہیں، ان کی قدر و قیمت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ تراجم اصل تصانیف سے مستغنی نہیں کر سکتے، کیونکہ اس صورت میں یہ فرض کرنا پڑے گا کہ مترجم کی فہم و دانش اسی درجہ کی ہے، جو اصل مصنف کی تھی، اور بھلا ابن البطریق

ابن ناعمہ، ابو قرہ، ابن فہر، ابن وہیلی اور ابن المقفع رحمہم اللہ تعالیٰ ارسطاطالیس کے جیسے اور خالد افلاطون کے جیسے کہاں ہو سکتے ہیں"۔

یہاں جاحظ کے ان اقوال پر تفصیلی بحث کا موقع نہیں ہے، اور اتنا ثابت کر دینا کافی ہے کہ ایک ایسی کتاب جو تیسری صدی کے نصف اول میں تصنیف ہوئی اس میں ابن المقفع کا ارسطو کے مترجم کی حیثیت سے ذکر ہے،

ایسی صورت میں یہ سوال کہ "کیا جبرئیلی اپنے شکوک میں حق بجانب نہیں ہے" بہت پیچیدہ ہو جاتا ہے، اور اس کا حل ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ہے، اور الفہرست بھی اس راہ میں صحیح نشاندہی کرتی ہے، اس سے قبل ہم نے لکھا ہے کہ ابن ندیم نے اس فصل میں جو اس نے عبداللہ ابن المقفع پر لکھی ہے، یونانی تراجم کے باب میں ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے، حالانکہ یہ اہم مسئلہ ایسا نہ تھا جس کو ابن ندیم نظرانداز کرتا، خصوصاً جب کہ اس نے دوسرے مقام پر بھی اس کا ذکر کیا ہے، اس صورت میں اس کا بہت زیادہ احتمال ہے کہ اس فصل میں اس کا ذکر نہ کرنا، اسکی دلیل ہو کہ وہ ارسطو کے مترجم اور ادیب مشہور کو ایک شخص نہ سمجھتا ہو، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ وہ ارسطو کی دو کتابوں (قاطیغوریاس اور باری ارمینیاس) کے مترجمین کی فہرست میں صرف "ابن المقفع" کا ذکر کرتا ہے، نہ کہ "عبداللہ بن المقفع" کا، اس سے یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں دو مختلف اشخاص اور آپس میں رشتہ دار تھے، جن میں سے ہر ایک "المقفع" کے نام سے موسوم تھا، جس طرح اس کے اسلاف موسوم تھے،

یہ نظریہ ایک دوسرے طریقے سے بآسانی ثابت ہو جاتا ہے، چنانچہ ایک نیا گربوسیدہ مخطوطہ، جو سینٹ جوزف کالج بیروت کی لائبریری میں نمبر ۳۳۸ پر ہے، جس کا کئی سال ہوئے فرالانی نے تفصیلی ذکر کیا ہے، ایساغوجی، قاطیغوریاس، باری ارمینیاس اور انالوطیقا کے

عربی ترجمہ پر مشتمل ہے، جسے محمد بن عبداللہ المقفع نے کیا تھا، اس سے اس مسئلہ میں شک باقی باقی نہیں رہ جاتا کہ یہ وہی مترجم ہے جس کی طرف الفہرست اور جاحظ نے اشارہ کیا ہے،

یہ بھی ممکن ہے کہ محمد بن عبداللہ (بن) المقفع اس مشہور کاتب کے بیٹے کے سوا کوئی دوسرا شخص نہ ہو، کیونکہ دوسرے ماخذوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن المقفع کے واقعی ایک لڑکا تھا، جس کا نام محمد تھا، چنانچہ الفہرست ص ۱۱۸ میں ہے کہ اسلام لانے سے قبل اس کی کنیت ابوعمر تھی، بعد میں ابو محمد ہوئی، اور ابن خلکان نے صراحۃً اس کے بیٹے محمد کا ذکر کیا ہے، البتہ ہم اسکی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، اس روایت کو کہ عبداللہ بن المقفع منصور کا کاتب تھا، ان لوگوں کے سوا اور کوئی بیان نہیں کرتا جو ارسطو کی کتابوں کے ترجموں کو اس کیجانب منسوب کرتے ہیں، میرا گمان غالب ہے کہ یہ روایت درحقیقت اس کے بیٹے محمد سے متعلق ہے، کیونکہ عبداللہ بن المقفع نے جیسا کہ جبرئیلی نے مقالۂ مذکور میں لکھا ہے کہ ۱۳۹ھ میں وفات پائی، اس لیے یہ بہت ممکن ہے کہ یہ اس کا بیٹا ہوگا، جو خلیفہ منصور المتوفی ۱۵۸ھ سے متوسل تھا،

اب ہم اس چیز کی طرف رجوع کرتے ہیں جو بیروت کے مخطوط میں درج ہے، اور اس پر بحث کریں گے، کہ اس کا مضمون اس کے عنوان کی تائید کرتا ہے یا نہیں، اس بحث میں ہم فرلانی کے بیان پر اکتفا کریں گے،

فرلانی کہتا ہے کہ جس چیز کی ہم کو تحقیق کرنا ہے وہ ارسطو کی مذکورۂ بالا کتابوں کا ترجمہ نہیں بلکہ ان کی شرحوں کا مختصر خلاصہ ہے، جو ابن ندیم کے اس بیان کے مطابق ہے کہ ابن المقفع نے صرف قاطیغوریاس، اور باری ارمنیاس کا خلاصہ کیا تھا، ابن ندیم کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ زیر بحث مسئلہ خود ان کتابوں کا نہیں بلکہ ان کی شروح کا ہے،

ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ ارسطاطالیسی شرح کیا تھی، جو بعد میں ظہور میں آئی، کیونکہ فرلانی نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے اس کے زیادہ گہرے مطالعہ اور موازنہ میں مدد نہیں ملتی، خود فرلانی نے شرح المقولات کے مقدمہ میں اس تقابل وتشابہ کی طرف اشارہ کیا ہے، جو شرح المقولات اور یحیٰی نحوی اور سرجیوس راس عینی کی شرحوں کے درمیان پایا جاتا ہے، لیکن اس کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرفوریوس کی ایساغوجی کی شرح قدیم مترجمین کے طبقۂ متاخرین کے انداز پر کی گئی تھی، یعنی پہلے فلسفہ کے متعلق ایک عمومی مقدمہ ہے، جس میں فلسفیانہ مصطلحات کی تعریف اور علوم کی تقسیم ہے، پھر فرفوریوس کی کلیات خمسہ کی بحث ہے، اب اگر مخطوطہ کے جزء اول کے خاتمہ پر یہ لکھا ہے کہ "کتاب ایساغوجی ختم ہوگئی" تو اس کے بجائے یہ کہنا زیادہ صحیح ہوتا کہ "شرح کتاب ایساغوجی ختم ہوگئی" یہ بھی ممکن ہے کہ یحیٰی نحوی کی شرح ایساغوجی اس جزء اول کی اساس ہو، جو اب مفقود ہے، لیکن جیسا کہ بومشترک کا بیان ہے، ایک زمانہ میں سریانیوں اور عربوں میں اس کو بڑی اہمیت حاصل تھی،

البتہ باری ارمنیاس اور انالوطیقا کی شرحیں مکمل ہیں، اور ہر شرح مخطوطہ کے تقریباً سو سو اوراق پر مشتمل ہے، اس کے مترجم کا نام محمد بن عبداللہ (بن) المقفع تحریر ہے، اس کے متعلق ہم بعد میں گفتگو کریں گے،

اب مسئلہ یہ ہے کہ آیا منطق کی ان چاروں کتابوں کی شرحوں کی تلخیص یا ترجمہ کی نسبت اس شخص کی جانب صحیح ہے جس کی جانب وہ منسوب ہیں، یا اس کو آگے چل کر کسی قدیم مترجم (مسئلہ زیر بحث میں محمد بن عبداللہ (بن) المقفع) کی جانب منسوب کر دیا گیا ہے، فرلانی کو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ نسبت صحیح ہے، کیونکہ یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کوئی متاخر نسبت کرنے والا اپنی جگہ کا وی کو کسی مشہور مترجم یا کم از کم الفہرست کی مبہم عبارت کا لحاظ کرتے ہوئے

مشہور ادیب ابن المقفع ہی کی جانب منسوب کرنے کے بجائے محمد بن عبد اللہ بن المقفع سے ایک بالکل غیر معروف شخص کی جانب منسوب کرے، نفس کتاب سے متعلق داخلی تنقید کے ذریعے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے،

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کتابیں جن سے مترجم نے پیش نظر مخطوط میں اعتنا کیا ہے، فرفوریوس کی ایساغوجی اور منطق ارسطو کی پہلی تین کتابیں ہیں، اور فرلانی کے بیانات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مخطوطہ پوری انالوطیقا کی شرح پر مشتمل ہے یا نہیں، اور اس کو اتفاق پر محمول نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ مایرہوف کی بحثوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سریانی خانقاہوں کے مدارس ان چار کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب کی تعلیم یا تفسیر سے اعتنا نہیں کرتے تھے، اور غالباً اس کی وجہ متاخرین اسکندرانین کی تقلید تھی، جس کا بڑا سبب مذہبی رواج تھا، جیسا کہ اس کے ماخذ (الفارابی) سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکندریہ میں مصنفات ارسطو کی تدریس ایک مذہبی کونسل کی قرارداد کے مطابق صرف ان ہی کتابوں میں محدود کر دی گئی تھی، اور یہ رواج فارابی کے زمانے تک باقی تھا، ارسطو سریانیوں کے یہاں بھی صرف منطق کا مصنف سمجھا جاتا تھا، جس طرح قرون وسطیٰ کے لاطینی علماء کے یہاں سمجھا جاتا تھا، صرف مسلمانوں ہی نے اس ارض ممنوعہ میں داخل ہونے کی جرأت کی اور جو کچھ ارسطو نے لکھا اس میں سیاست کے سوا سب پر توجہ کی،

یہ واقعہ اس عبارت سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے جو ہمارے پیش نظر مخطوطہ کے ورق نمبر ۲۵ ہ پر خاتمہ کتاب کے طور پر مرقوم ہے، (فرلانی ص ۲۱۲)

"تم کتاب انولوطیقا ولیس بعدہ من ھذہ الکتب الا کتاب أفودالطبیعی ولم یمنعنا من استقصائہ الاما قد منا فی صدر الکتاب جماعارأینا کافیا عن التفسیر"

فرلانی کا یہ خیال غلط ہے کہ "افودالطبیعی" سے مراد ارسطو کی کتاب الطبیعہ ہے، اس لیے اس کے بجائے "السمع الطبیعی" ہونا چاہیے، کیونکہ یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ منطقی کتابوں کے سلسلے میں کتاب الطبیعہ کے ذکر کے کوئی معنی نہیں، دوسرے کتاب الطبیعہ کا قدیم عربی نام "سمع الکیان" ہے، نہ کہ "سمع الطبیعی" یا "السماع الطبیعی"۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہاں "افودالطبیعی" کے بجائے "افودیقطیقی" یا اس کے مشابہ کوئی ایسا لفظ ہونا چاہیے، جس کے معنی ارسطو کی التحلیل الثانی کے ہوں، یہ اس لیے کہ اصل عبارت یہ ہے:

"تم کتاب انولوطیقا ولیس بعدہ من ھذہ الکتب الا کتاب افود الطبیعی ولم یمنعنا من استقصائہ (دیکھئے روزی، جلد دوم ص ۱۴۱ ۳) الاما قد منا فی صدر الکتاب جماعارأینا (ممکن ہے کہ "رأیناہ" ہو) کافیا عن التفسیر"

اس کا افسوس ہے کہ بیروت کے مخطوطہ میں یہ مقدمہ محفوظ نہیں رہ گیا، ورنہ اس سے ہم کو ضرور کتاب ابودیقطیقا کے استقراء سے اعراض کے اسباب مل جاتے، ممکن ہے کہ لفظ "جماعا" میں تحریف ہو، اور صحیح لفظ "اجماعا" یعنی مذہبی کونسل کی قرارداد یا اس کے مانند کوئی اور چیز ہو، بہر حال یہ واقعہ کہ ہمارے پیش نظر مخطوطہ میں صرف ارغانون کی پہلی تین کتابوں اور ایساغوجی کے بارے میں بحث ہے، اس کا ثبوت ہے کہ جو کتاب ہمارے سامنے ہے وہ اس قدیم اسلوب کے قریب ہے جس اسلوب پر عہد اسلامی کی ارسطاطالیسی کتابیں تھیں،

اصطلاحات کتاب کی بحث ہمیں اسی نتیجے پر پہنچاتی ہے اور فرلانی نے بھی اس مسئلہ کی جانب متنبہ کیا ہے کہ مترجم نے پوری کتاب میں جوہر کے معنی کو لفظ "عین" سے تعبیر کیا ہے، حالانکہ تمام فلسفیانہ تراجم میں اس کے بجائے فارسی لفظ "جوہر" ہے،

یہ مسئلہ اس لیے اور بھی زیادہ اہم ہے کہ فلسفہ کے علاوہ دوسرے اسلامی فنون خصوصاً علم کلام اور تصوف وغیرہ کی کتابوں میں لفظ "عین" کے بجائے "جوہر" (اور "ذات") کا استعمال ہوا ہے، لیکن یہ اصطلاح بعد کی مترجمہ کتابوں اور ان اسلامی ارسطاطالیسی فلسفے کی کتابوں کی اصطلاح کے مقابلہ میں جو ان کی بنیاد پر مرتب کی گئیں، نامانوس ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ "عین" اسلام میں فلسفیانہ تعلیمات کے عہد اول میں ایجاد ہوا، اس کے بعد لفظ "جوہر" نے اسکو نکال دیا،

اس کے علاوہ شرح ایساغوجی کے ابتدائی کلمات جن کو فرلانی نے نقل کیا ہے، مثلاً

"ان لکل صناعۃ متاعاً" [یعنی ہر فن کے لیے ایک متاع ہونا ضروری ہے]

ممکن ہے کسی متن کا لفظی ترجمہ ہوں، مثلاً وہ عبارت جو شرح امونیوس میں کلیات خمسہ کے الفاظ کے لیے استعمال کی گئی ہے، جس کے ایک لفظ کا ترجمہ یہاں لفظ "متاع" سے کیا گیا ہے، حالانکہ عربی میں اس اصطلاح کا ترجمہ لفظ "موضوع" سے کیا جاتا ہے، اور وہ تقسیم بھی قابل غور ہے جو مخطوطہ کے گزشتہ صفحہ میں موجود ہے، اس سے ہماری مراد یہ تقسیم ہے:

(۱) حکمۃ تبصر القلب وتفکرہ — وہ حکمت جو قلب کے تبصر وتفکر سے متعلق ہے،

(۲) حکمۃ حرکۃ القلب وقوتہ — وہ حکمت جو قلب کی حرکت اور اسکی قوت سے متعلق ہے

ان دو قسموں سے مراد علوم نظریہ اور علوم عملیہ ہیں، اگر ہم پوری کتاب پر غائر نظر ڈالیں تو یونانی فلسفیانہ اصطلاحات کے ترجمہ کے تغیرات اور ان کلمات کو جو بعد میں ان کی جگہ استعمال کیے گیے، شرح وبسط سے بیان کر سکتے ہیں، لیکن جن اصطلاحات کا ہم نے ذکر کیا وہ مخطوطہ کی اس تاریخ کے تعین کی تائید کے لیے کافی ہیں، جسے ہم نے دلائل سے ثابت کیا ہے، اگرچہ مخطوطہ کی اصطلاحات کی قدامت سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ یہ ترجمہ دوسرے تراجم کی طرح یونانی یا سریانی زبان سے نہیں، بلکہ درمیانی زبان فارسی (پہلوی) سے کیا گیا ہو جیسا کہ فرلانی کا خیال ہے،

کیونکہ یہ مسئلہ کہ یونانی لفظ اوسیا (جس کے معنی جوہر ہیں) کا ترجمہ فارسی لفظ "جوہر" سے نہیں، بلکہ عربی لفظ "عین" سے کیا جاتا تھا، فرلانی کے خیال کے برعکس ثابت کرتا ہو، ہمارے پاس اس کا ایک اور ثبوت بھی ہے کہ محمد بن عبد اللہ (بن المقفع) کے ترجمہ (یا خلاصہ) کی اصل یونانی ہے، جسے ہم بعد میں بیان کریں گے،

مخطوطہ کی توقیع سے ان نتائج کی جن تک ہم پہنچ سکے ہیں ایک ایسے طریقے سے تائید ہوتی ہے جس کی ہمیں توقع بھی نہ تھی، اس کے لیے ہم محرف متن مطبوعہ فرلانی کو نقل کرتے ہیں، اس کے بعد ضروری تصحیح کے بارے میں گفتگو کریں گے،

"تمت کتب الثلاثۃ من ترجمۃ محمد بن عبد اللہ المقفع، وقد ترجمہا
بعد محمد، ابو نوح الکتاب النصرانی، ثم ترجمہا بعد ابی نوح، سلمۃ الحرانی
صاحب بیت الحکمۃ لیحیی بن خالد برمکی للیث الاربعۃ کلہا قبل ہؤلاء
الترجمتین الذین تکسانی المدکانی النصرانی"

اس عبارت میں پہلا اشکال "صاحب بیت الحکمۃ" کا فقرہ ہے، گفتگو یہاں اور غالباً ان کی پہلی تین کتابوں کے ان تراجم سے ہے جو محمد کے ترجمہ کے بعد ابو نوح اور سلم نے کیے تھے، ان دو ترجمین کے بارہ میں ہم بعد میں بحث کریں گے، یہاں پر اتنا اشارہ کر دینا کافی ہو کہ وہ بیت الحکمۃ جس کا صدر سلم تھا، اس کو مامون ہی نے قائم کیا تھا، اس لیے یہ ناممکن ہے کہ اس نے ارسطو کی کتابوں کا جو ترجمہ کیا تھا، وہ یحیی بن خالد برمکی کے لیے کیا ہو جس کا سال وفات زیادہ سے زیادہ ۱۹۰ھ (=۸۰۵ء) ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ "قبل ہؤلاء الترجمتین" کا فقرہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں بھی گفتگو محمد ہی کے ترجمہ کے متعلق ہے، اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ متن میں لفظ "یحیی" سے قبل لازمی طور پر کچھ نقص (Lacuna) ہوگا، اور

اس نقص میں محمد بن عبداللہ (بن) المقفع ہی کے کاموں کے متعلق کوئی فقرہ ہوگا، اس بنا پر متن کی تکمیل کے باب میں میرا میلان مندرجۂ ذیل اصلاح کی جانب ہے،

"وقد ترجم محمد بن عبد اللہ المقفع، یحییٰ بن خالد البرمکی الکتب

الاربعۃ کلھا"

لیکن یہاں پر ایک دوسری دقت اس عبارت کے آخری کلمات خصوصاً لفظ "تکسانی" کی وجہ سے ہے، اس لیے کہ لفظ "الذین" کے بعد ایک فعل ہونا چاہیے جس کا فاعل "الملکانی النصرانی" ہے، اب یا وہ فعل تحریف شدہ لفظ "تکسانی" میں موجود ہے، یا یہ لفظ اس الملکانی کے تحریف شدہ نام یا اس کے کلیسائی عہدے کو ظاہر کرتا ہے، اور فعل کاتب سے سہواً چھوٹ گیا ہے،

یہ بات پہلی ہی نظر میں توقیع کی مذکورۂ بالا عبارت سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہمارے پیش نظر ایک ایسی پرانی تصنیف کا تذکرہ ہے (سلم کا مذکورۂ بالا ترجمہ) جو کہ مامون کے زمانے میں لکھی گئی مگر اس سے پہلے جب کندی اور حنین نے ان کتابوں کی تفسیر و تلخیص کی تھی، ورنہ ان دونوں کے نام ضرور مذکور ہوتے، اور یہ توقیع ہم کو اسلام میں ارسطاطالیسی تقالید پر نظر ڈالنے کا موقع دیتی ہے، جو کسی اور ذریعہ سے ممکن نہ تھا،

فرلانی نے محمد بن عبداللہ (بن) المقفع کے ساتھ دوسرے دو مترجمین کی شخصیتوں کے بارے میں تحقیق کی زحمت نہیں گوارا کی، حالانکہ ان کے متعلق ہم بہت کچھ جانتے ہیں، سلم جس کا لقب صاحب بیت الحکمت ہے، وہ مامون کا ہمعصر تھا، اس کے متعلق الفہرست صفحہ ۱۲۰ میں ہے کہ سہل بن ہارون سے جو اپنے زمانہ کا مشہور کاتب اور مامون کے خزانۃ الحکمۃ کا مہتمم تھا، اس کے گہرے تعلقات تھے، وہ مترجم تھا اور خاص طور پر فارسی سے عربی میں ترجمہ کرتا تھا، غالباً اس سے مراد وہ اقتباسات ہیں جو اس نے کلیلہ و دمنہ سے تیار کیے تھے، جیسا کہ

الفہرست کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، الفہرست ص ۲۴۳ (اور ابن ابی اصیبعہ جلد اول ص ۱۸۷) میں یہ بھی ہے کہ اس کو دوسرے علماء کے ساتھ یونانی مصنفین کی کتابوں کی تلاش کے لیے قسطنطنیہ بھیجا گیا تھا، اسی طرح الفہرست ص ۲۶۸ اور ابن القفطی ص ۹۷ میں ہے کہ اس مترجم کو مجسطی کے ایک قدیم ترجمہ کی اصلاح کا کام بھی سپرد کیا گیا تھا، اور اسٹینشنیدر جو اس کو (سلم کو) مترجم سلام الابرص سمجھتا ہے، اس کا یہ خیال غلط ہے، وہ حران کا باشندہ تھا، اس کا علم ہمیں صرف اسی توقیع سے حاصل ہوتا ہے، جو ہمارے مخطوطہ کے خاتمہ پر ثبت ہے،

وہ شخص جو ارسطو کی کتابوں کے مترجمین میں سلم سے پہلے گذرا ہے، اس توقیع کی رو سے ابو نوح "الکاتب النصرانی" تھا، اس کی شخصیت کو ہم یقینی طور پر متعین کر سکتے ہیں، کیونکہ جاثلیق طیماتاؤس اول (متوفی ۸۲۳ء) جسے خلیفہ مہدی اور ہارون رشید کے درباروں میں بڑا مرتبہ حاصل تھا اور جس کو خلیفہ نے ارسطو کی کتابوں کے عربی زبان میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا تھا، وہ اکثر اپنے رسائل میں جن میں سے ۵۸ رسالے اب بھی محفوظ ہیں، ان تراجم کا ذکر کرتا ہے، اور یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ان تراجم میں ابو نوح نے اس کو مدد دی، چنانچہ اس خط میں جو اس نے قیس فثیون کو بھیجا تھا (مجموعہ رسائل کا نمبر ۴۳) ارسطو کی کتاب طوبیقا کے عربی ترجمہ کا ایک خاص طرز سے ذکر کیا ہے، اس کا وہ حصہ جو اس ترجمہ سے متعلق ہے، یہ ہے:

"خلیفہ نے ہم کو ارسطو فلسفی کی کتاب طوبیقا کو سریانی زبان سے عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا، اور بفضل خدا اس کام کو شیخ ابو نوح نے انجام دیا، میں نے اس حصے میں جو سریانی زبان متعلق تھا کسی قدر اس کی مدد کی، وہ خود سریانی اور عربی دونوں میں خاص مہارت رکھتا ہے، ممکن ہے کسی نے بھی پہلے اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا ہو (ہم نے اس سے قبل بھی تم کو اس کے متعلق لکھا تھا، اور اس سلسلے میں جو واقعات پیش آئے، ان کی خبر بھی دی تھی) لیکن یہ ترجمہ خلیفہ کی

کی نظر سے نہیں گزرا اور یہ تراجم نہ صرف لفظی بلکہ معنوی حیثیت سے بھی سقیم ہیں، ایک تو موضوع کی دشواری کی وجہ سے، دوسرے مترجمین کی کم علمی وجہ سے"

رسائل طیماتاوس میں دوسرے مقامات پر بھی ابونوح کا تذکرہ ملتا ہے، اور اسمانی نے عمرو بن متی طرہانی کی کتاب تاریخ البطارقہ پر اعتماد کرکے اس کے متعلق بعض دوسری چیزوں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے اس کا نام اور زیادہ متعین ہو جاتا ہے، مثلاً اس کے نام کے ساتھ انباری لکھا ہے، اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ وہ موسیٰ بن مصعب والی موصل کا کاتب تھا، (اس کا مقابلہ اس کے لقب کاتب نصرانی سے کیجئے جو بیروت کے مخطوطہ کی توقیع میں موجود ہے) اور تعلیم میں طیماتاوس کا ہم سبق اور اس کا دوست بھی تھا، اس نے ۲۷۹ھ میں اس کے جاثلیق منتخب ہونے میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں، ایک چیز یہ بھی قابل غور ہے کہ عبدیشوع نے اس کی کتابوں کی فہرست میں ایک کتاب کا ذکر کیا ہے، جو قرآن مجید کی تردید میں ہے، (شراجادی قرآن) لیکن ہمارے نزدیک یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی کہ وہ وہی ابونوح بن الصلت ہے جس کو الفہرست نے ص ۲۴۴ میں یونانی زبان کے مترجمین کے زمرے میں ذکر کیا ہے،

ان واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ارسطو کی کتابوں کے مختلف تراجم کے متعلق جو کچھ توقیع میں مذکور ہے وہ بالکل صحیح ہے، اور محمد بن عبد اللہ (بن) المقفع نے خلیفہ مہدی یا ہادی کے عہد خلافت میں ارغانون کی کتابوں کا یحییٰ بن خالد کے لیے خلاصہ اور ترجمہ کیا، اور نصرانی کاتب ابونوح، ہارون رشید کا معاصر تھا، لیکن سلم جو بیت الحکمۃ کا مہتمم تھا، اس نے ایک مدت کے بعد مامون کے عہد خلافت میں اس کام کو انجام دیا، توقیع میں ایک ایسی قیمتی روایت ہے، جس سے تاریخ اسلام میں قدیم ترین ارسطا طالیسی تراجم کا پتہ چلتا ہے، ان تراجم کی تاریخ کے لیے ضروری ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مترجم اول نے سریانیوں کے طریقے کے مطابق

ارغانون کی صرف پہلی تین کتابوں کا ترجمہ کیا، لیکن ابونوح اور طیماتاوس کے زمانے میں دوسری کتابوں کا بھی ترجمہ ہوا، جیسا کہ ہم اس سے قبل بیان کر چکے ہیں، یا کم از کم اس کے کچھ حصوں خصوصاً کتاب طوبیقا کا ترجمہ ہوا، اور اس کے ساتھ ابودیقطیقا، کتاب الخطابہ اور کتاب الشعر کا بھی ترجمہ کیا گیا، پھر بھی فلسفۂ ارسطو سے واقفیت کا دائرہ منطقی کتابوں کے علاوہ مامون ہی کے عہد میں وسیع ہوا، ممکن ہے سلم برانے طبقے سے تعلق رکھتا ہو، لیکن ترجمہ کی وہ تحریک جس کا علمبردار حنین بن اسحاق تھا، اور جس کا سلسلہ چوتھی صدی کے نصف آخر میں یحییٰ بن عدی اور ابن زرعہ تک قائم رہا، اسی تحریک نے ارسطو کی جملہ تصانیف کو مسلمانوں کے لیے فراہم کیا،

رہا یہ سوال کہ محمد بن عبد اللہ (بن) المقفع کا ترجمہ یا خلاصہ سریانی زبان سے ہوا یا یونانی سے تو اس کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرنا ممکن نہیں، کیونکہ اس مقصد کے لیے پورے مخطوطہ پر غائر نظر ڈالنا ضروری ہے، طیماتاوس نے اپنے مقدم الذکر رسالہ میں ارسطو کی کتاب طوبیقا کے ان قدیم تراجم کے بارے میں جو بلا واسطہ یونانی زبان سے کیے گئے، جو کچھ لکھا ہے، اگر اس کو ملحوظ رکھا جائے تو میرے نزدیک اس کا امکان ہے کہ محمد نے سریانی ترجمہ کے وسیلہ براہ راست اصل یونانی سے ترجمہ کیا ہو،

بہر حال اس بحث سے ہم جن نتائج تک پہنچے ہیں مسلمانوں کی علمی تاریخ کے اعتبار سے انکی بہت بڑی اہمیت ہے، کیونکہ اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ارسطا طالیسی کتابیں قطعی فارسی زبان سے عربی میں ترجمہ نہیں کی گئیں، جیسا کہ اکثر لوگوں کا خیال ہے، اور اس کا سبب ابن المقفع کی جانب منسوب ایک روایت ہے جس کے سمجھنے میں لوگوں نے غلطی کی، نیز یہ کہ تاریخ اسلام میں ارسطا طالیسی تراجم کی پہلی منزل جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا، اہل مغرب (سریانی قوم اور اہل اسکندریہ) کے ارسطا طالیسی تصانیف کے ساتھ اعتنا سے کوئی علٰحدہ چیز سمجھنے کا امکان نہیں، اور یہ چیز اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب اس کو ہم ملحوظ رکھیں، کہ اہل فارس کا اثر ریاضی اور علم الافلاک میں برابر قائم رہا جیسا کہ نلینو اور اسکا نے

ثابت کیا ہے، اسی طرح اسلام کے ابتدائی زمانے میں علم طب پر بھی مشرق کا اثر پڑا اور طب ہندی جو اس وقت فارس کے بڑے بڑے مدارس میں چھائی ہوئی تھی، قریب قریب اس میں ضم ہو گئی،

بااین ہمہ ان چیزوں میں یونان کا ترکہ اس درجہ قوی اور مستحکم تھا کہ اس نے تقریباً تمام مشرقی عناصر کو ان سے نکال پھینکا، اور یہ چیز تیسری صدی کے اختتام سے پہلے تک موجود تھی، جہاں تک فلسفہ کا تعلق ہے، اس پر مشرق کا کوئی مستقل اثر نہیں پڑا، یہ ممکن ہے کہ ارسطو اور افلاطون کی تصانیف نوشیروان کے لیے فارسی زبان میں ترجمہ ہوئی ہوں، جیسا کہ اجیناس کا بیان ہے، گو یہ روایت اس کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے ثابت نہیں ہوتی، البتہ یہ ثابت ہے کہ اسلام سے قبل جندیسا پور اور ایران کے دوسرے شہروں میں طب کے اعلیٰ مدارس میں فارسی زبان میں فلسفہ کی تعلیم ہوتی تھی، ممکن ہے فلسفیانہ اصطلاحات مثلاً یونانی لفظ اوسیا کے لیے جوہر کا لفظ ان ہی مدارس نے وضع کیا ہو، لیکن یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ یونانی فلاسفہ کی کتابوں میں سے کوئی بھی کتاب فارسی زبان سے عربی میں ترجمہ نہیں کی گئی،

دیوان حافظ میں الحاق

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب، لکھنؤ یونیورسٹی

(۳)

حافظ و شاہان ہند

ہندوستان کے بادشاہوں کی علم نوازی ضرب المثل تھی، وہ علماء و فضلا کی سرپرستی میں اشرفیاں پانی کی طرح بہاتے تھے، اور عرب و ایران کے علما و شعرا کو زر کثیر دے کر اپنے یہاں بلواتے، حافظ کے معاصر بادشاہوں نے بھی قدیم روایات کو برقرار رکھا اور شعر و سخن کی قدر دانی کا پورا ثبوت دیا، حافظ کی ایک غزل میں شاہ غیاث الدین کا نام آیا ہے، جو بنگال کا بادشاہ معلوم ہوتا ہے، اس بادشاہ نے حافظ سے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی، مگر سلطان مذکور کی شخصیت میں اختلاف ہے، اسلیے تعلقات پر روشنی ڈالنے سے قبل اسکی شخصیت کا تعین ضروری ہے،

غیاث الدین نام کے حسب ذیل[1] بادشاہوں کا نام ہندوستان کی تاریخ میں ملتا ہے،

۱- غیاث الدین بلبن بادشاہ دہلی ۶۶۳ھ - ۶۸۵ھ

۲- غیاث الدین تغلق " ۷۲۱ھ - ۷۲۵ھ

۳- غیاث الدین بن شاہ اسکندر بادشاہ بنگال و لکھنوتی ۷۶۸ھ - ۷۷۵ھ

۴- غیاث الدین تغلق بن سلطان فیروز شاہ بادشاہ دہلی ایک سال ۷۹۱ھ

۵- غیاث الدین بہمنی بن محمود شاہ بہمنی بادشاہ دکن چند ماہ ۷۹۹ھ

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۷۴، ۱۲۱، ج ۲ ص ۲۹۶ - ج ۱ ص ۱۵۰، ۳۰۴، ج ۲ ص ۲۵۴ - ۲۵۵

۶۔ غیاث الدین بن سلطان محمود خلجی سلطان مالوہ ۸۰۳ھ - ۹۰۶ھ

اس فہرست سے ظاہر ہے کہ صرف تیسرے اور چوتھے غیاث الدین حافظ کے معاصر تھے، اور چونکہ حافظ نے اپنی غزل میں "بنگالہ" کا نام صراحتہً لکھا ہے، اس لیے سواے غیاث الدین بن شاہ اسکندر بادشاہ بنگال کے اور کوئی دوسرا مراد نہیں ہو سکتا،

بعض لوگوں نے[1] اشارہ کیا ہے کہ بادشاہ بنگال نے حافظ کو دعوت بھیجی تھی، مگر یہ خیال صحیح نہیں، حافظ نے سلطان غیاث الدین کے بھیجے ہوئے مصرعوں پر جو غزل لکھی تھی وہ غزل[2] یہ ہے:

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ میرود — وین بحث با ثلاثۂ غسالہ میرود

می دہ کہ نوعروس چمن حد حسن یافت — کار این زمان ز صنعت دلالہ میرود

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند — زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

طی مکان ببین و زمان در طریق شعر — کاین طفل یک شبہ رہ یکسالہ میرود

آن چشم جادوانۂ عابد فریب بین — کش کاروان سحر ز دنبالہ میرود

از رہ مرو بعشوۂ دنیا کہ این عجوز — مکارہ می نشیند و محتالہ میرود

باد بہار می وزد از گلستان شاہ — وز ژالہ بادہ در قدح لالہ میرود

حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دین — خامش مشو کہ کار تو از نالہ میرود

فزونی استرآبادی مولف کتاب "بحیرہ"[3] حسام الدین عوض خلجی (غیاث الدین خلجی) کی حکومت کے ضمن میں لکھتا ہے:

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات ایران (شفق) چاپ دوم، ص ۵۰۳، مقدمہ دیوان ثرمان ص ۸۶۔ [2] اس میں ایک بیت اور بھی جو الحاقی ہے: خوی کردہ می خرامد و بر عارض سمن :: از شرم روی او عرق از ژالہ میرود

[3] یہ کتاب ۱۰۲۳ھ میں کشمیر میں مکمل ہوئی (ملاحظہ ہو میخانۂ عبدالنبی حالات فزونی استرآبادی) اور تہران میں ۱۳۲۸ھ میں طبع ہوئی، مولف نے ہندوستان اور ایران کے بہت دلچسپ حالات بہم پہنچائے ہیں،

"متوجہ ہندوستان ہوا اور محمد بختیار سے مل گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسب عتاب سکہ و خطبہ ہو گیا اور اس کا خطاب سلطان غیاث الدین ہوا، چنانچہ خواجہ حافظ نے حسب ذیل مقطع میں اشارہ کیا ہے:

حافظ بیا[1] بمجلس سلطان غیاث دین — خامش مشو کہ کار تو از نالہ میرود

کہتے ہیں کہ غسالہ نام ایک مطرب سلطان غیاث الدین خلجی کی مجلس میں تھی، اور اسکی تین لڑکیاں سرو و گل و لالہ تھیں، جو حسن و موسیقی و رقص میں ماہر روزگار تھیں، ایک روز غایت شوق سے بادشاہ کی زبان پر حسب ذیل مصرعہ جاری ہوا، ع ساقی حدیث سرو و گل الخ۔ اس نے شعراے دربار سے دوسرا مصرعہ لگانے کا حکم دیا، مگر کوئی بادشاہ کے منشا کے مطابق مصرعہ لگانے میں کامیاب نہ ہوا، ایک تاجر مجلس میں موجود تھا، اس نے دفعتہً حافظ کا نام لیا، بادشاہ نے حافظ کے متعلق مزید حالات دریافت کیے، تاجر نے کہا ایک جوان شاعر ہے جس نے تازہ تازہ شعر کہنا شروع کیا، اس کے بعد حافظ کے کچھ شعر سنائے جو بادشاہ کو بہت پسند آئے، اور اس نے تاجر کے ذریعہ اس مصرعہ پر غزل کہنے کی فرمایش کی، ایک سال کے بعد تاجر شیراز واپس آیا اور حافظ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوغات اور رقعہ دیکر سلطان کے دربار کے سارے حالات بیان کیے، خواجہ حافظ بہت محظوظ ہوئے اور غزل کہنے پر راضی ہو گئے، دوسرے دن جمعہ تھا، صبح تاجر کی ملاقات خواجہ سے ہو گئی، غزل ہو چکی تھی، اور یہ مصرعہ اسی مناسبت سے کہا تھا

این طفل یک شبہ رہ یکسالہ میرود

مجلس کے خصوصیات معلوم ہی ہو چکے تھے، سلطان کے مصرعہ پر یہ گرہ لگائی

وین بحث با ثلاثۂ غسالہ میرود

غزل تاجر کو مل گئی اور کچھ دنوں کے بعد تاجر ہندوستان آیا اور غزل بادشاہ کو پیش کی ہے

---

[1] کذا فی الاصل،

بہت پسند آئی۔ "و شصت خروار قماش نفیس سوای عطریات و دیگر چیزہا بخدمت خواجہ

ارسال داشت و مثل ایں پیوستہ خواجہ را بسوغات لایق یادآوری مینمود"۔

ظاہر ہے کہ مولف بحیرہ نے اس واقعہ کو جس بادشاہ سے متعلق بتایا ہے، وہ غیاث الدین بن اسکندر

شاہ بنگالہ سے الگ ہے، اس میں صرف نام کا اشتباہ نہیں، بلکہ واقعات بھی مختلف ہیں، مولف کے

نزدیک وہ بادشاہ ادنیٰ درجے سے ترقی کرکے بادشاہ ہوا تھا، حالانکہ غیاث الدین شاہ بنگال ایسا نہ تھا،

اس کا باپ بھی بادشاہ تھا، ڈاکٹر محمد معین[1] نے "بحیرہ" کے بیان کردہ سلطان غیاث الدین کو سلطان غیاث الدین

ابن محمود خلجی بتایا ہے، مگر یہ غلط ہے، اس لیے کہ سلطان غیاث الدین خلجی کا باپ شاہ محمود خلجی مالوہ

کا نہایت جلیل القدر بادشاہ تھا، اس لیے بحیرہ کی تفصیل اس بادشاہ پر بھی پوری طرح نہیں اترتی،

صرف غیاث الدین تغلق[2] چھوٹے درجے سے بڑے درجے تک پہنچا تھا، پہلے وہ حاکم دیبالپور و لاہور

تھا، پھر ناصر الدین خسرو خاں کو ۷۲۱ھ میں شکست دیکر غیاث الدین کے نام سے دہلی کا

فرمانروا ہوا، مگر اول تو اس کا نام غازی ملک تھا، جبکہ بحیرہ کے مطابق بادشاہ کا نام حسام الدین

عوض خلجی تھا، دوسرے وہ حافظ کا معاصر نہیں ہو سکتا، کیونکہ ۷۲۱ھ[3] میں حافظ پیدا بھی نہیں ہوئے

تھے، بہرحال بحیرہ کے بیان کیے ہوئے حالات اس نام کے کسی ایک بادشاہ پر پورے نہیں اترتے

اور غالباً یہی وجہ ہو کہ لوگوں نے "بحیرہ" کی بیان کی ہوئی تفصیل سے اختلاف کیا ہے، اور یہ

"گنجینہ عرفان" کے بیان کے مطابق اور بقول "ڈاکٹر معین[4]" "تعبیر بحیرہ درست تر و با متن

غزل موافق تر است"۔ البتہ بحیرہ کا یہ بیان بالکل صحیح ہو کہ یہ غزل صرف ایک ہی بحر میں تیار ہو گئی تھی،

لیکن ڈاکٹر قاسم غنی نے اس غزل کو سلطان غیاث الدین محمد بن سلطان عماد الدین احمد

[1] حافظ شیرین سخن ص ۲۶۵ [2] دیکھیے فرشتہ ج اول ص ۱۲۱ بعد [3] حافظ کا سنہ پیدائش ۷۲۶ھ کے قریب رہا ہوگا [4] حافظ شیرین سخن ص ۲۶۵ حاشیہ [5] ایضاً (متن)

ابن مبارز الدین محمد کی طرف منسوب کیا ہے[1]، ان کے بیان کے ضروری اجزاء درج ذیل ہیں،

"غزلی را کہ خواجہ درباره او سروده در اینجا نقل کنیم:

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ میرود | وین بحث با ثلاثہ غسالہ[2] میرود الخ

سلطان غیاث الدین محمد پسر بزرگ سلطان عماد الدین احمد بن امیر مبارز الدین محمد است کہ

در تواریخ آل مظفر... کمتر نام او برده شده است۔ از جملہ محمود گیتی در وقایع سال ہفتصد

و نود و سہ نوشتہ است کہ سلطان زین العابدین از اصفہان نزد عم خود سلطان احمد بکرمان

فرستاده استمداد جست کہ متفقاً با شاه منصور بجنگند و در ماه صفر سلطان احمد با فرزند

سعید شہید [خود] سلطان غیاث الدین محمد متوجہ سیرجان شد"۔ ....

کلمہ سلطان جزو اسم او ست کہ در زمان آل مظفر شائع بود و بسیاری از شاہزادگان این

خانواده کلمہ "سلطان" ضمیمہ اسم آنہا بوده است ....

شبلی نعمانی و از قول او مرحوم اوداردبرون نوشتہ اند کہ مقصود از این "سلطان غیاث الدین"

مذکور در غزل خواجہ حافظ یکی از ملوک ہند است ولے شبلی نعمانی ہیچ ماخذی بدست نمیدہد

و تصور میرود کہ اشتباه او ناشی از این بیت باشد:

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند۔ الخ

مرحوم اوداردبرون با کمال احتیاط و با مسئولیت خود شبلی این قصہ را نقل میکند زیرا در ہیچ

جای دیگر صحبتی از این موضوع نیست"۔

[1] تاریخ عصر حافظ ص ۴۲۰ - ۴۲۱ [2] مضمون شعر عربی است کہ "شرب اللبنین علی طعام ثلاثۃ، فیہا الشفاء وصحۃ الابدان۔ وقیل القدح الاول یکسر العطش والثانی یمری الطعام والثالث یفرح النفس ومازاد علی ذالک فضل"۔ محاضرات جلد اول ص ۳۲۳ (بحوالہ تاریخ عصر حافظ ص ۴۲۰ حاشیہ ۱)

لیکن یہ قول درست نہیں معلوم ہوتا، اس لیے کہ جہاں غیاث الدین کو سلطان لکھا ہے وہاں اسے اس بیت میں شاہ بھی قرار دیا ہے:

باد بہار می وزد از گلستان شاہ الخ

اس سے صاف ظاہر ہے کہ غیاث الدین صرف شاہزادہ ہی نہ تھا بلکہ اچھا خاصہ بادشاہ تھا،

دوسری بات یہ ہو کہ یہ غزل غیاث الدین ہی کے نام پر معلوم ہوتی ہو، اس لیے اس کا یہ شعر یقیناً بادشاہ ہی سے متعلق سمجھا جائے گا:

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند   زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

بنگالہ کا فقرہ غیر مربوط نہیں ہے، اس لیے غیاث الدین کو شاہ بنگال تصور کرنا بالکل صحیح ہو، اور جبکہ اس نام اور لقب کا بادشاہ اسی زمانے میں بنگال میں موجود تھا تو خواہ مخواہ اس سے انکار کرنا درست نہیں،

تیسری بات یہ ہے کہ کم از کم ایک قدیم ماخذ[1] نکل ہی آیا، اور میرے خیال میں مولانا شبلی کے سامنے اس کے علاوہ دوسرا کوئی اور ماخذ رہا ہوگا۔

حافظ اور محمود بہمنی تاریخ فرشتہ سے معلوم[2] ہوتا ہے کہ شاہ محمود بہمنی (۷۸۰ھ - ۷۹۹ھ) بڑا سخن ور اور علم نواز بادشاہ گزرا ہے، ایک بار ایک ایرانی شاعر اس کے دربار میں آیا اور قصیدہ پیش کیا، بادشاہ نے ایک ہزار "تنکۂ طلا" مرحمت کیا، اس طرح اسکی سخاوت و قدر شناسی عالمگیر ہوئی، خواجہ حافظ اس بادشاہ کا حال سنکر "راغب سفر دکن" ہوئے، لیکن بعض موانع کی وجہ سے ان کا ارادہ "قوت" سے "فعل" میں تبدیل نہیں ہوتا تھا، جب میر فیض اللہ انجو[3] نے کچھ زاد سفر

[1] قزوینی کی بحیرہ جو ۹۲۲ھ کی تالیف ہو، قزوینی کی ایک اور کتاب فتوحات عادلشاہیہ عادلشاہیوں کی تاریخ ہے، جسکا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہو [2] ج اول ص ۳۰۲ [3] حافظ شیریں سخن ص ۲۴۴ پر یہ نام میر افضل اللہ دیا ہے، (باقی حاشیہ ص ۲۲۷ پر)

شیراز بھیج کر دکن آنے کی دعوت دی تو حافظ بڑے شوق سے تیار ہوگئے، اور زاد سفر میں سے کچھ اپنے بھانجوں اور بیواؤں کو دیا اور کچھ سے قرض ادا کرکے ہندوستان کے ارادہ سے لاہور تک آئے، یہاں اپنے اپنے ایک دوست کو پریشانی میں دیکھ کر بالکل تہیدست ہوگئے، لیکن دو ایرانی سوداگر مسمی زین العابدین ہمدانی اور خواجہ محمد گازرونی حافظ کے سفرخرچ کے متکفل[1] ہوگئے، اور سب ساتھ "ہرمز" پہنچے، خواجہ حافظ ان دونوں کے ساتھ محمود شاہی کشتی[2] میں جو دکن سے آئی تھی سوار ہوئے، ابھی کشتی روانہ نہیں ہوئی تھی کہ باد مخالف کے چلنے سے سمندر میں طوفان آیا، خواجہ بہت گھبرا گئے اور اس سفر سے اتنا متنفر ہوئے کہ بہانہ کرکے کشتی سے اتر گئے اور ایک غزل[3] کہہ کر ایک دوست کے ذریعہ میر فیض اللہ انجو کی خدمت میں بھیجدی،

دمی باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد   بمی بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد الخ

جب یہ غزل میر فیض اللہ کے پاس پہنچی تو انھوں نے موقع سے بادشاہ کو حافظ کے سارے واقعات سے مطلع کیا، بادشاہ نے ملا محمد قاسم مشہدی کو جو دربار کے وابستگان میں تھے "ہزار تنکہ طلا" دیا کہ ہندوستان سے سامان خرید کر خواجہ حافظ کے پاس شیراز لیجائیں"

مگر اس سارے بیان میں اس بات کا ادنی اشارہ نہیں کہ شاہ محمود نے حافظ کو دکن آنے کی دعوت دی

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۶) اور اسے علامہ سعد الدین تفتازانی کا شاگرد بتایا ہے، لیکن ص ۲۶۷ (متن) میں میر فیض اللہ ہی ہے، نیز ملاحظہ ہو حاشیہ ص مذکور۔ مقدمہ پژمان ص ۳، پر میرزا فضل الہ ملتا ہو،

[1] تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہو کہ حافظ ان سوداگروں کے برتاؤ سے خوش نہ تھے، ج ا ص ۳۰۲ [2] مگر مقدمہ پژمان ص ۳، پر کرایہ کی کشتی کا ذکر ہے [3] فرشتہ میں اس غزل کے ۸ شعر درج ہیں، جن میں یہ شعر الحاقی ہو

بشو ای نقش دلتنگی کہ در بازار یکرنگی   بہ نعمتہای گوناگوں می احمر نمی ارزد

اسکے بجائے خلخالی، قزوینی اور پژمان نے یہ بیت دی ہے: ترا آن بہ کہ روئے خود ز مشتاقاں بپوشانی :: کہ شادی جہانگیری غم لشکر نمی ارزد اسکے علاوہ دو اور الحاقی بیتیں اس غزل میں موجود ہیں: (۱) دیار و یار مردم را مقید میکند لیکن :: چہ جای پارس کایں محنت جہاں یکسر نمی ارزد (۲) برو در کنج قناعت جو بکنج عافیت بنشین :: کہ یکدم تنگدل بودن بہ بحر و بر نمی ارزد (نیز ملاحظہ کیجئے پژمان ص ۹۲ ج ہی)

اس غزل میں قدیم نسخوں کی رو سے صرف ۷ اشعار ہیں، لکھنؤ اڈیشن میں ۱۰ شعر ہیں، جن میں مندرجہ بالا تین یقیناً الحاقی ہیں (نولکشوری ۱۸۸۸ء) ص ۱۲۰ - ۱۲۱) اور یہ الحاق حافظ کے سفر دریا کے قرائن کو قوی کرنے کی بنا پر عمل میں آیا تھا،

تھی، لیکن بعض کتابوں[1] سے پتہ چلتا ہے کہ خود شاہ نے حافظ کو دکن مدعو کیا تھا، حافظ کے دل میں ہندوستان آنے کا خیال پہلے سے نہ تھا،

ڈاکٹر معین[2] نے حسب ذیل غزل کو بھی شاہ محمود سے متعلق بتایا ہے،

من باشم کہ بران خاطر عاطر گذرم   لطفہا میکنی ای خاک درت تاج سرم

دلبرا بندہ نوازیت کہ آموخت بگو   کہ من این ظن بہ رقیبان تو ہرگز نبرم

ہمتم بدرقہ راہ کن ای طایر قدس   کہ دراز است رہ مقصد و من نوسفرم

ای نسیم سحری بندگی ما برسان   کہ فراموش مکن وقت دعای سحرم

خرم آنروز کزین مرحلہ بربندم رخت   وز سر کوی تو پرسند رفیقان خبرم

پایۂ نظم بلند است و جہانگیر بگو   تا کند "پادشہ بحر" دہان پر گہرم

راہ خلوتگہ خاصم بنما تا پس ازین   می خورم با تو و دیگر غم دنیا نخورم

حافظا شاید اگر در طلب گوہر وصل   دیدہ دریا کنم از اشک و در و غوطہ خورم

اس کے بعد خود ڈاکٹر موصوف[3] نے یہ اضافہ کیا ہے:

"بعضی تصور کردہ اند کہ این غزل دربارہ پادشاہ ہرمز گفتہ شدہ و "پادشہ بحر" است ولی بنظر صحیح نمی آید، زیرا حافظ ہرگز او را ندیدہ و پس از مراجعت حافظ بشیراز بود کہ صلہ شاہ ہرمز بدو رسید، و ہیچگاہ خواجہ بدیدن او نرفت در صورتیکہ در غزل فوق خواجہ فرماید "راہ خلوتگہ خاصم بنما الخ"

لیکن اگر حافظ کے بادشاہ ہرمز کو نہ دیکھنے کی وجہ سے یہ غزل اس کی طرف منسوب نہیں ہو سکتی تو یہی وجہ تو شاہ محمود بہمنی کے انتساب میں بھی حائل ہو سکتی ہے،

دوسرے یہ کہ شاہ محمود کو "پادشہ بحر" کہنا ناموزوں ہے، کسی جزیرہ کے بادشاہ کے لیے

[1] مجلہ نوبہار شمارہ ۱ بحوالہ حافظ شیرین سخن ص ۱۲۴ [2] ایضاً ص ۲۹۸ [3] ص ۱۲۵ حاشیہ

البتہ یہ خطاب دلپذیر ہوگا،

تیسرے یہ کہ مقطع میں بھی دریا کے سارے مناسبات کا بیان ظاہر کرتا ہے کہ ممدوح کا تعلق سمندر سے ضرور تھا،

چوتھے یہ کہ بیت ششم[1] جس سے ڈاکٹر موصوف نے اس کی عام نسبت سے انکار کیا ہے از روئے دیوان خلخالی ص ۲۰۷ و قزوینی الحاقی ہے، اور تمام کے یہاں بھی متن میں نہیں حاشیہ میں اضافہ ہے، اور ساتھ ہی یہ نوٹ بھی ہے: "این بیت ہم در این غزل است و نسبت آن بخواجہ مناسب" (ص ۱۹۶)

ان تفصیلات کے باوجود ڈاکٹر قاسم غنی اس غزل کو شاہ ابو اسحٰق اینجو کی طرف منسوب کرتے ہوئے حافظ کے سفر دکن اور دعوت ہندوستان کو افسانہ قرار دیتے ہیں[2]:

"افسانۂ کہ راجع بسفر دریائی خواجہ حافظ و عزم ہندوستان داشتن و بعد منصرف شدن او نوشتہ اند (رجوع شوید بتاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۰۲ فارس نامہ ناصری ج ۲ ص ۱۴۵) از روی این شعر دیس آسان می نمود اول غم دریا ببوے سود :: غلط کردم کہ این طوفان بصد گوہر نمی ارزد) و امثال آن ساختہ شدہ است و بطوریکہ در قسمت "شرح حال خواجہ حافظ" خواہیم گفت، اساس تاریخی ندارد، در این غزل احتمال قوی میرود کہ بیت چہارم، شکوہ تاج سلطانی الخ اشارہ بشاہ شیخ ابو اسحٰق باشد زیرا او تنہا شاہی است کہ در زمان او (حافظ) در فارس کشتہ شدہ است"

ڈاکٹر غنی نے "بحث در افکار و احوال حافظ" کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس کی دو جلدیں یعنی "تاریخ عصر حافظ" اور "تاریخ تصوف در اسلام" تو حلیۂ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں، لیکن اس سلسلے کی سب سے اہم کتاب یعنی "شرح حال خواجہ حافظ" کی تکمیل کا موقع ابھی نہیں آیا، اس لیے ڈاکٹر موصوف کی تحقیقات سے ہم واقف نہ ہو سکے، جو انھوں نے حافظ کے متعلق کی ہیں اور ہم ان دلائل سے محروم

[1] نیز ملاحظہ ہو حافظ شیرین سخن ص ۱۶۹ [2] تاریخ عصر حافظ ص ۱۳۷ حاشیہ نمبر ۱

رہے، جن کی بنا پر وہ حافظ کے سفر ہندوستان کو افسانہ اور بے اساس ٹھہراتے ہیں، انکی عدم موجودگی میں کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم فرشتہ کے قول کو مسترد کر دیں، جس کا علم تاریخ دکن کے بارے میں نہایت وسیع تھا، اور جس نے اس سفر کی ساری تفصیلات دی ہیں، اس کے علاوہ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر فرشتہ کو اس واقعہ کے گھڑنے میں کیا مصلحت تھی،

اگر ڈاکٹر قاسم غنی کے اس قوی احتمال کو کہ شکوہ تاج سلطانی الخ والی بیت شاہ اسحٰق کے قتل پر دلالت کرتی ہے،[1] حقیقت سمجھ لیا جائے تو بھی یہ کیونکر تسلیم کیا جاسکے گا کہ پوری غزل اسی واقعہ سے متعلق ہے، غزل جیسی داخلی شاعری سے جس کی ہر بیت عموماً دوسری بیت سے معنوی طور پر کوئی علاقہ نہیں رکھتی، اس طرح کا استنباط صحیح نہ ہوگا، اکثر دیکھا گیا ہے کہ غزل کا ایک شعر کسی پرانے دردناک واقعہ پر مبنی ہوتا ہے، مگر اس کے دوسرے ابیات کا اُس خاص واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس لیے ڈاکٹر صاحب کے مفروضات کی تائید کے باوجود ان کا نتیجہ فی الحال قابل قبول نہیں، البتہ اگر ان کے سارے دلائل سامنے ہوتے اور ان کی تائید کسی اہم تاریخی ماخذ سے ہوتی تو ان کا نتیجہ ضرور قابل توجہ ہوتا، ورنہ جو واقعہ اس قدر مشہور ہو چکا ہو اس کو یوں ہی افسانہ کہہ کر مسترد نہیں کیا جاسکتا،

---

[1] شاہ کا قتل ۷۵۸ھ میں واقع ہوا، اس وقت حافظ کی عمر زیادہ سے زیادہ ۳۰ - ۳۱ سال کی رہی ہوگی، چونکہ غزل میں جن خیالات کا اظہار ہے وہ بڑے تجربے پر مبنی ہیں اس لئے اتنی عمر کے نوجوان کی طرف منسوب نہیں ہو سکتے۔ غرض یہ بات مسلم ہی ہے کہ یہ غزل شاہ موصوف کے قتل کے بہت بعد بھی لکھی گئی۔ اس لحاظ سے اسکو شاہ اسحٰق سے متعلق بتانا صحیح نہیں ہے۔

آثارِ علمیہ

مکاتیب مولانا سید سلیمان ندوی بنام شاہ معین الدین احمد ندوی

مورخہ ۳ جنوری ۱۹۵۱ء

(۸)

برادر عزیز القدر دفقکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ آپ کے اس اظہار سے خوشی ہوئی کہ آپ دار المصنفین کو دو کی یادگار سمجھ کر باقی رکھنے کی کوشش کریں گے، میری عمر چاند کے حساب سے ۶۹ سال کی ہوئی، اب نئے کام کا وقت نہ تھا، مگر کیا کیا جائے کہ تقدیر الٰہی یہی تھی، دیسنہ ویران ہو چکا، اعظم گڈھ میں قلب کے لیے راحت کا سامان نہ تھا، تیسری جگہ کا قصد کیا، ۷ ماہ ہو چکے ہیں، ہنوز روز اول ہے یعنی دل و دماغ فیصلہ سے عاجز ہیں، گو زمانہ خود فیصلہ کر رہا ہے، سرکاری قید سے ابتک آزاد ہوں،

دار المصنفین کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ اس کو دوبارہ منظم کیا جائے، ارکان کچھ چل بسے کچھ چل رہے ہیں، کچھ بے تعلق ہو گئے، اس لیے ارکان کا انتخاب کر کے تعداد پوری کر لیں، پھر ان میں سے ارکان عاملہ کو چنیں، ارکان عاملہ کی ایک کمیٹی ہو، جو علمی و عملی دونوں شعبوں کی نگرانی کرے، علمی نظامت آپ قبول کر لیں اور عملی مولوی صاحب رہیں، جیسے ابتک ہیں، عاملہ کی خالی جگہوں میں سے ایک پر ناظم علمی کی حیثیت سے آپ خود ہی ممبر ہو جائیں گے، مولوی مناظر صاحب کو بھی لے لیں، انتظامیہ میں صباح الدین صاحب کو لے لیں، سید عبد الحکیم دیسنہ اور سید مرتضیٰ علی صاحب دہلوی بھی ہو سکتے ہیں، مجلس دار المصنفین کی

صدارت ڈاکٹر محمود صاحب کو دیجائے، ماجد میاں کو مجلس انتظامیہ کی صدارت دے سکتے ہیں، گو مولانا حمید الدین کے بعد یہ عہدہ غیر ضروری ہوگیا ہے، میں نے سنا ہے کہ ماجد میاں کا وظیفہ حیدر آباد والا بند ہوگیا ہے، اچھا ہو کہ دار المصنفین ان کو وظیفہ دے کر اپنالے،

میرے یہاں آنے کے بعد کیا دار المصنفین کی مانگ میں ترقی نہیں ہوئی ہے؟ دار المصنفین نو لکشور پریس نہیں ہے، جس کا مقصد محض سرمایہ پیدا کرنا ہو، بلکہ وہ ایک ذہنی دعوت ہے، جس کا ہر جگہ پھیلانا بھی اس کی کامیابی ہے،

۱۱ر کو دہلی سے ہوائی جہاز سے مشرقی پاکستان کا قصد ہے، ہفتہ عشرہ میں واپسی ہوگی،

والسلام سید سلیمان

(۹)

سید سلیمان ندوی — مورخہ ۱۳ر مئی ۱۹۵۱ء

برادر عزیز وفقکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ معارف آیا، دیکھکر خوش ہوا، اولاد کسی کی طرف منسوب ہو، مگر اصلی باپ کو بہرحال اس کو دیکھکر خوشی ہوتی ہے، میں نے پہلے بھی لکھا ہے اور اب پھر لکھتا ہوں کہ اپنی تکمیل کے ساتھ ایک دو نئی صلاحیت کے طلبہ کی تربیت بھی ضروری ہے تاکہ یہ کام چلتا رہے، میرے خیال میں دار المصنفین صرف ایک دار الاشاعۃ نہیں، بلکہ ایک دینی و ذہنی دعوت ہے، جس نے ہزاروں کو متاثر کیا ہے، جس طرح اس کی ضرورت ہندوستان کو ہے، اس سے زیادہ ضرورت اس کی پاکستان کو ہے،

انکار حدیث کا فتنہ یہاں پھیل رہا ہے، ضرورت ہے کہ معارف کے تمام پچھلے مضامین ایک ترتیب خاص سے مرتب کرکے چھپوائے جائیں، یہ کام اگر وہاں ہو سکتا ہو تو وہاں چھپوایئے، ورنہ مرتب کرکے یہاں بھیجئے تو یہاں چھاپا جائے

اسی طرح میرا پرانا خیال جو صحاح ستہ کی تاریخ کا تھا، اسکو پورا کیجئے، موطا اور بخاری پر میرا، مسلم پر مولوی عبد السلام صاحب کا اور ترمذی پر آپ کا مضمون ہے، غرض اس کو مکمل کرکے چھپوایئے یا مسودہ

یہاں بھیجئے تو یہاں چھاپا جائے،

جاڑوں سے میرے داہنے ہاتھ میں درد رہتا ہے، تیل کی مالش ہوتی ہے، مگر ہنوز زائل نہیں ہوا ہے، اس لیے لکھنے میں تکلیف ہوتی ہے،

ڈاکٹر عبد الحیٔ صاحب کے خط میں آپنے جو کچھ لکھا ہے، اس کو پڑھکر متاثر ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے سایہ میں رکھیں اور توفیق عمل عطا فرمائیں،

مولوی عبد السلام صاحب سلام قبول فرمائیں، مولوی مسعود علی صاحب تو ابھی وطن ہوں گے، عزیزی صباح الدین بھی وطن میں ہوں گے،

کتبخانہ میں خطبات عرب و ہند کا ایک اور نسخہ ہوگا جس کے آخر میں میرے کچھ اضافے ہیں عبد الباری حبیب سے کہکر اس اضافہ کی نقل بھجوا دیں،

یحییٰ صاحب سے کہکر سیرۃ نبوی، سیر الصحابہ اور تاریخ اسلام کے ہر حصہ کے پانچ پانچ نسخے رجسٹرڈ ڈاک سے بھجوادیں،

مولانا شبلی مرحوم کی تصانیف یہاں تمام مطبع والے چھاپ رہے ہیں، چنانچہ تاج کمپنی والوں نے بھی شروع کردیا ہے،

آم یہاں مل رہے ہیں، مگر آپ والے کہاں،

ہاں حسرت موہانی پر کچھ لکھ رہا ہوں، اگر لکھے تو بھیجدوں، والسلام

سید سلیمان

(۱۰)

مورخہ ۱۹ر رمضان ۱۳۷۰ھ

عزیز مکرم حفظکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم، آپ کے دو کارڈ ملے، آفتاب احمد سلمہٗ کے لیے ایک تحریر جاتی ہے، الیاس احمد جن کا نام آپ نے لکھا تھا وہ تو آئے نہیں، انکا انتظار کیا، اب آپکے دوبارہ طلب پر آپ ہی کے نام

بھیج رہا ہوں، آپ لکھتے ہیں کہ میرے گذشتہ ملفوف میں کوئی جواب طلب بات نہ تھی، میں نے آپ سے عرب و ہند کے تعلقات کے اس دوسرے نسخہ کے آخر سے جو دارالمصنفین میں ہے، ان قلمی اضافوں کی ایک نقل مانگی تھی، جو اس میں میں نے کیے تھے، اور لکھا تھا کہ مولوی عبدالباری صاحب سے نقل کرا کے بھیجئے، آپ گرمی اور روزے کی شدت میں بھول گئے،

(۱) خواتین اسلام کی بہادری کا ایک نسخہ بھیجدیجئے، یحییٰ صاحب نے جو نسخہ بھیجا تھا وہ بیچ سے ناقص ہے،

(۲) رسالہ اہل السنۃ کی کاپی اگر کتبخانہ میں ہو تو چند روز کیلیے بھیجدیجئے، طبع جدید کے بعد واپس کردونگا،

(۳) میں نے ایران سے فارسی زبان میں خیام کے فلسفیانہ رسالے منگوائے تھے، آپ فلسفہ کی الماری میں دیکھیں، چھوٹی تقطیع ہے، اس کا نام اور پتہ صاف لکھوا کر بھیجدیجئے، ورنہ وہی رسالہ کچھ دن کے لیے بھیجدیجئے،

چند آم از قسم چونسہ وغیرہ بازار سے ہاتھ آئے ہیں، ڈاکٹر آفتاب احمد سے ڈھاکہ میں ملاقات ہوئی تھی،

والسلام

سید سلیمان، ۲۵ر جون ۱۹۵۱ء

۱۱

۳ر اگست ۱۹۵۱ء

برادر عزیز القدر، ادام اللہ توفیقکم بما یحب و یرضیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کا لفافہ پہنچا جس سے تشفی ہوئی، خط کے جواب میں دیر ہوتی ہے تو یہی شبہہ ہوتا ہے کہ ضائع ہوگیا، امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے، کتابیں پہنچیں، رسالہ درخواست نامہ خیام جو آپ نے بھیجا ہے، یہی مطلوب تھا، افسوس ہے کہ ناقص نکلا یعنی ناقص ہی شائع ہوا ہے، میری کتاب خیام میں کلیات الوجود کے نام سے پورا رسالہ ہے، مگر کرم خوردگی کے سبب سے ہمارے نسخہ کے بعض حروف پڑھے نہ جا سکے، انکی اس سے تصحیح ہوگئی، رسالہ سے فراغت اسی دن ہوگئی، اس کو واپس بھیجدوں گا،

حسرت پر میرا مضمون ابتک لکھا ہوا ہے کوئی صاف کرنے والا نہیں، جو صاف کردے، اس لیے کہ کاتب سے غلطیوں کا ڈر ہے،

مولانا شیروانی پر جو میں نے لکھا تھا اور معارف میں چھپا تھا میرا خیال ہے کہ میں نے صحیح لکھا تھا، مگر آپکے یہاں غلط چھپا، اگر میرا اصلی مسودہ مطبع سے مل سکے تو دیکھیے کہ میں نے نسین لکھا تھا، وہ آپ کے ہاں غلام محی الدین چھپا، اس پر برہان والوں کو موقع ہاتھ آیا، چونکہ آپ مجھے اپنی محبت سے اپنے بزرگوں کا درجہ دیتے ہیں، اس لیے دو نصیحتیں کرتا ہوں، ایک یہ کہ دارالمصنفین کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ آگے بھی یہ چراغ جلتا رہے، اسلیے جوہر قابل کی تلاش میں رہیں، اور جب کوئی ملے تو اس کی تربیت کریں،

دوسری چیز یہ ہے کہ من نہ کردم شما حذر بکنید اپنا جائز حق کبھی نہ چھوڑیے، دنیا اسکی قدر نہیں کرتی، میں نے اپنی سادگی اور دنیا ناشناسی سے ہر جگہ نقصان اٹھایا، آپنے بہت اچھا کیا جو جامعہ یا مدرسہ عالیہ کا قصد نہیں کیا، دارالمصنفین سے باہر کبھی قدم نہ رکھیں، آپ کا معاوضہ حسب ضرورت ہمیشہ بڑھ سکتا ہے، آپ اس کو اپنی زندگی کا کام بنائیں، ورنہ یہ لاکھوں کا سرمایہ اور عمروں کا حاصل تباہ ہو جائیگا،

اب آیندہ آپ کیا لکھنا چاہتے ہیں، کوئی موضوع پیش نظر ہے، عرب و ہند کے تعلقات کا جو نسخہ وہاں ہے اس کے بالکل آخر میں دیکھیں، چند سطریں اضافہ کیلیے قلم سے لکھی ہیں، جس میں جمہور کے جوتوں کا ذکر ہے، اس کو نقل کرکے بھیجدیجئے، اس کا پہلا نسخہ جو میرا تھا، آپ کا بھیجا ہوا مل گیا،

کتب احادیث صحاح ستہ کی تاریخ کے بارہ میں آپنے کچھ نہیں لکھا۔

والسلام

سید سلیمان

(۱۲)

کراچی ۵ ۱۳ر دسمبر ۱۹۵۱ء

برادر عزیز السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمدللہ بخیریت ہوں، آجکل تقویت اعصاب کے انجکشن اور تقویت قلب کی مفرح دوا کھا رہا ہوں، یہاں اجمیر کے ایک شریف و مخلص ندوی طبیب حکیم نصیر الدین ندوی مل گئے ہیں، تمام ندویوں کے یہاں وہ مرکز محبت ہیں، نہایت شریف و فیاض و مخلص نوجوان ہیں مجھے اور میرے تعلق کے تمام احباب و اعزہ سے

محبت کرتے ہیں، وہ بیچارہ اکثر میرے معالج رہتے ہیں، ڈاکٹری معالج ڈاکٹر یونس صاحب ہیں،

یکم دسمبر ۱۹۵۱ء کو ٹنڈو آدم (نواب شاہ سندھ میں) جو یہاں سے چند گھنٹوں کے راستہ پر ہے، ایک مدرسہ ندوۃ العلوم کی بنیاد ایک ندوی عالم وطبیب حکیم بابو عبداللہ (بارہ بنکی) نے ڈال دی، جلسہ میں اکثر ندوی برادری کے اصحاب اور بعض دیوبند کے حضرات موجود تھے، حکام برسرامداد ہیں،

معارف میں لکھنؤ کانفرنس کی روداد پڑھی، امید ہے کہ آپ کا مضمون بھی جلد پڑھوں گا،

پاکستان میں سرکاری امداد سے ایک ہسٹاریکل کانفرنس بن گئی ہے، اسکا آئندہ اجلاس مارچ میں لاہور میں ہوگا، اگر آپ یا صباح الدین صاحب کوئی تاریخی مضمون بھیج سکیں تو بھیج دیں، میں ڈابل بندر کی جائے وقوع کی تعیین پر لکھنا چاہتا ہوں، اگر آپ عرب جغرافیہ کی کتابوں میں بلاذری سے لیکر انساب سمعانی تک سے ڈابل کے متعلق عبارتوں کے اقتباسات بھیجدیں تو بڑی مدد ملے، کیا آپ یہ کر سکتے ہیں،

والسلام سید سلیمان

(۱۳)

کراچی ۵

عزیز مکرم زادکم اللہ تعالیٰ توفیقاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپکا کارڈ ملا اور دیبل کے اقتباسات ملے جزاکم اللہ تعالیٰ، ان دنوں متفرق کاموں میں مصروف رہا، یہاں مصروفیت زیادہ تر جلسوں کمیٹیوں اور ملاقاتوں اور دعوتوں میں رہتی ہے، ابھی کسی منظم کام کی بنیاد نہیں پڑی ہے، کوششیں جاری ہیں، اللہ تعالیٰ کامیاب فرمائیں، بالفعل احتفال علماء الاسلام اور عربی کانفرنس بنام جمعیۃ العربیہ کے اجلاس فروری کے ہمارے واسطے ہو رہے ہیں، مصر اور شام کے اضطرابات کے باعث وہاں سے کوئی نہیں آرہا ہے، باقی ممالک سے آنے والوں کی امید ہے، یہ دنیائے اسلام کے علماء کا پہلا تاریخی اجتماع ہوگا، خدا کرے کہ اتفاق واتحاد پر اسکا انجام ہو، شیعہ علماء بھی ایران وعراق سے آرہے ہیں، خبر تونس کے علماء کے آنے کی بھی ہے، الجزائر اور عراق سے لوگ آچکے ہیں، سیلون سے آرہے ہیں،

آپکا اردو والا مضمون پڑھا، اچھا اور مفید ہے، جامعہ میں کیا موضوع بیان ہوگا، کیا جامعہ اسلامیہ کا تخیل اب بھی باقی ہے، دار المصنفین کی روداد ملی، بحمد اللہ اسکی آمدنی اس کی بقا کی ذمہ داری کر رہی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ بھوپال بند ہو چکا اور حیدرآباد سے بھی آئندہ امید نہیں۔

والسلام سید سلیمان، ۱۱ فروری

مطبوعات جدیدہ

بہادر شاہ اور انکا عہد

از مولوی رئیس احمد صاحب جعفری ندوی تقطیع بڑی، ضخامت ۶۰۰ ۳ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، پتہ کتاب منزل کشمیر بازار لاہور

مولوی رئیس احمد صاحب جعفری ان زود قلم مصنفین میں ہیں، جن کے قلم سے تصانیف کا دریا رواں رہتا ہے، وہ ایک ایک سال میں کئی کئی کتابیں لکھ ڈالتے ہیں، اور ایسی ایسی ضخیم کہ ایک ایک کتاب کئی کئی کتابوں پر بھاری ہوتی ہے، مذکورہ بالا کتاب بھی اسی قسم کی عظیم الجثہ تصنیف ہے، یہ بہادر شاہی عہد کا مرقع ہے جس میں اس کے ہر رخ کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، یہ دور اگرچہ تیموریوں کے خاتمہ کا زمانہ تھا، ان کی شان وشوکت قصہ پارینہ بن چکی تھی، پھر بھی دلی کی تہذیبی بہار پورے شباب پر تھی اور بقول میر

دلی کے نہ کوچے تھے اوراق مصور تھے   جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

لیکن انقلاب ۱۸۵۷ء میں اس بہار پر بھی خزاں آگئی، اس دور کے متفرق سیاسی، علمی اور تمدنی حالات مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں، کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جس میں اس عہد کی پوری تصویر نظر آ جائے، اسی مقصد کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس میں اس دور کے ہر رخ کی جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، اور اس جامعیت کے ساتھ کہ اس کا کوئی اہم رخ چھوٹنے نہیں پایا ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے عنوانات کی فہرست ۵۴ صفحوں میں آئی ہے، اس کی موٹی موٹی سرخیاں یہ ہیں، بہادر شاہ کے پہلے کا سیاسی

پس منظر، ان کے دور کے سیاسی حالات، انگریزوں سے تعلقات کی نوعیت، بہادر شاہ کے ذاتی حالات اور ان کے اوصاف و خصوصیات، قلعہ معلی کی زندگی، تیموری تہذیب کے مختلف مرقعے، دلی کے علماء و مشائخ، شعرا و ادبا و ارباب ہنر، اخبارات، علمی و ادبی ترقیاں، بہادر شاہ کے عہد کی نئی نسل، انگریزوں کی الحاق کی پالیسی، مختلف ریاستوں کا انضمام، ان کی بدعہدیاں، غدر کے اسباب و نتائج، اور اس کے حالات وغیرہ، ان میں سے ہر بحث بڑی جزوی تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے، جس سے بہادر شاہ کے عہد کی پوری تاریخ اور اس زمانہ کی دلی کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے، مصنف کی انشا پردازی اور زور قلم پوری کتاب میں نمایاں ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ اتنے گوناگوں مباحث میں تمام واقعات کا تحقیقی معیار پر پورا اترنا ضروری نہیں ہے، لیکن اس سے بہادر شاہی عہد کی تاریخ کا نہایت موثر اور دلکش مرقع نظر آجاتا ہے،

سیرت اشرف ۔ مرتبہ جناب منشی عبد الرحمن صاحب، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۵۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ ادارہ نشر المعارف، چلیک ملتان شہر،

حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے مفصل سوانح عمری دربار اشرفی کے خسرو خواجہ عزیز الحسن غوری مرحوم نے ان کی زندگی میں لکھی تھی، جو کئی جلدوں میں ہے، اس موضوع پر دوسری اہم کتاب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی تالیف حکیم الامت ہے جو ایک خاص طرز سے مرتب کی گئی ہے، اس کے علاوہ مولانا مرحوم کے خلفا، اور متوسلین نے مختلف پہلوؤں پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے ہیں، ان کے ملفوظات اور تحریروں میں بھی ان کے کمالات اور کارناموں کا بڑا مواد موجود ہے، اب اس سلسلہ کے ایک اور متوسل منشی عبد الرحمن صاحب نے ان سب کی مدد سے سیرت اشرف مرتب کی ہے، اس میں حضرت مولانا کے مختصر سوانح، ان کے اخلاق و سیرت، عادات و خصائل، کمالات و خصوصیات اور علمی و مذہبی کارناموں کو بڑی جامعیت و اختصار

کے ساتھ مرتب کیا ہے، اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کی جامعیت اور ترتیب ہے، حضرت مولانا کے متعلق جن معلومات کے لیے بہت سی کتابوں کی ورق گردانی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تنہا اس کتاب میں مل جاتے ہیں، اس لحاظ سے یہ کتاب حضرت مولانا کے حالات و سوانح کا خلاصہ و عطر ہے۔

کتاب الآثار امام محمد ۔ مترجمہ جناب مولانا ابو الفتح محمد صغیر الدین صاحب، ضخامت ۳۰۶ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، قیمت مجلد آٹھ روپئے، پتہ محمد سعید اینڈ سنز ناشران و تاجران کتب، قرآن محل، مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الآثار حدیث کی نہایت قدیم اور احناف کی اہم ترین کتابوں میں ہے، حتی کہ موطا امام مالک سے بھی قدیم ہے، اس سے پہلے حدیثوں کے جو مجموعے تالیف کیے گئے، ان میں بغیر کسی ترتیب کے محض احادیث و سنن کو جمع کر دیا گیا تھا، اور اب وہ ناپید بھی ہیں، کتاب الآثار پہلی کتاب ہے جو فقہی ترتیب پر مرتب کی گئی ہے اور جس میں حضرت امام اعظم کا تفقہ بھی نمایاں ہے، اس کے بعد کے تمام مولفین نے اس کی تقلید کی، یہ کتاب صحابہ کرام اور ائمہ عظام کے نوسو منتخب آثار کا مجموعہ ہے، اس لیے قدامت و صحت اور ترتیب و تفقہ ہر لحاظ سے یہ کتاب حدیث کی ممتاز ترین کتابوں میں ہے، اور امام اعظمؒ کے بہت سے تلامذہ سے مروی ہے جن کے نسخوں میں حذف و اضافہ اور باہم اختلاف و ترمیم بھی ہے، ان میں امام محمد کی روایت کردہ کتاب الآثار سب میں زیادہ جامع اور مستند ہے، اور کتاب الآثار امام محمد کے نام سے موسوم ہے، اردو میں اب تک اس کا ترجمہ نہیں ہوا تھا، اس لیے مولانا ابو الفتح محمد صغیر الدین صاحب نے مع اصل کے اس کو اردو کا جامہ پہنایا ہے، اور جابجا فوائد کے ماتحت ضروری امور و مسائل کی تشریح بھی کر دی ہے، ترجمہ صاف و سلیس ہے، کتاب کے شروع میں امام محمد کا مختصر حال، حضرت امام اعظمؒ کے فضل و کمال، ان کے حفظ و اتقان حدیث میں ان کے درجہ، کتاب الآثار کی تالیف کی تاریخ، اس کی خصوصیات پر تبصرہ اور

اس کے مزید مختلف نسخوں کا ذکر ہے،

موطا امام محمد مترجم اُردو، مترجمہ خواجہ عبد الوحید صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۴۰۵ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، پتہ: محمد سعید اینڈ سنز، ناشران و تاجران کتب، قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی،

حدیث کی کتابوں میں موطأ امام مالک کا درجہ محتاج بیان نہیں، اس کے بھی بہت سے رواۃ ہیں، ان میں دو راویوں کی موطا زیادہ مشہور ہے، ایک یحییٰ بن یحییٰ اللیثی اندلسی کی روایت کردہ، دوسری امام محمد شیبانی کی، پہلی عرف عام میں موطا امام مالک کہلاتی ہے، اور دوسری موطا امام محمد، ان دونوں میں موطا امام محمد کو بھی اسکی بعض خصوصیات کی بنا پر امتیاز حاصل ہے، موطا امام محمد کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے، مگر وہ پرانے طرز کا ہے، اسلئے خواجہ عبد الوحید صاحب نے مع اصل کے ترجمہ کیا ہے، اور جا بجا فوائد کے عنوان سے تشریح طلب امور کی شرح بھی کر دی ہے، کتاب کے شروع میں مولانا عبد الرشید صاحب کے قلم سے ایک مقدمہ ہے، جس میں موطا امام مالک اور موطا امام محمد کا مفصل تعارف اور ان کی خصوصیات وغیرہ کا ذکر ہے، یہ مقدمہ زیادہ تر موطا امام محمد پر مولانا عبد الحئی مرحوم فرنگی محلی کے مبسوط عربی مقدمہ سے ماخوذ ہے۔

قصص النبیین، جزء ثالث۔ جناب مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۳۸ صفحات، خوشخط ٹائپ میں عمدہ کاغذ پر چھپی ہے، قیمت تحریر نہیں، مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو سے ملیگی۔

فاضل مولف نے عربی مدارس کے طلبہ کیلئے انبیاء علیہم السلام کے قرآنی قصص پر عربی ریڈروں کا جو مفید سلسلہ شروع کیا ہے، یہ اسکا تیسرا حصہ ہے، اسمیں حضرت موسیٰؑ کا قصہ ہے اور بنی اسرائیل کے قیام مصر کے زمانہ سے حضرت موسیٰؑ کی وفات تک بنی اسرائیل کو جو واقعات پیش آئے، انکو جن جن حالات سے گزرنا پڑا اور پیہم انعامات الٰہی کے بعد انکی سرکشی کی سزا میں انکا جو انجام ہوا، انکو قرآنی آیات کی روشنی میں بڑے موثر اور سبق آموز انداز میں بیان کیا گیا ہے، اس طرح اس کتاب کے ذریعہ عربی زبان کیساتھ مذہب و اخلاق کی بھی تعلیم ہو جاتی ہے، اور طلبہ کو قرآن مجید سے بھی مناسبت پیدا ہو جاتی ہے، کتاب کی خوبیت کے لیے مصنف کا نام نامی پوری ضمانت ہے،

"م"

جلد ۷۹ ماہ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۵۷ء نمبر ۴

فہرست مضامین